

# جنگ عظیم کے ہیرو

سید سعید احمد

PDFBOOKSFREE.PK



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## معزز قارئین توجہ فرمائیں!

پاکستان ورچوئل لائبریری پر موجود تمام کتابیں  
قارئین کے مطالعے اور دعوتی و اصلاحی مقاصد کے  
لئے اپلوڈ کی جاتی ہیں۔

### تنبیہ

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر  
استعمال کرنے کی سخت ممانعت ہے، اور ان کتب کو  
تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی  
، قانونی و شرعی جرم ہے۔



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY  
[www.pdfbooksfree.pk](http://www.pdfbooksfree.pk)

# جنابِ عظیم کے ہیرو

سید سعید احمد



فایز سنٹر

لاہور ● راولپنڈی ● کراچی



# فہرست

۵	۱۔ ونسٹن چرچل کا تاریخی فرار
۱۷	۲۔ ترکی کے قیدی
۳۱	۳۔ سمندر میں گھیراؤ
۳۷	۴۔ موت کے دروازے تک!
۴۴	۵۔ لارنس آف عربیا
۵۵	۶۔ درشاہن صفت ہوا باز
۶۳	۷۔ مجاہدِ ریف۔ غازی عبدالکریم
۷۳	۸۔ خونِ بہاراں
۸۰	۹۔ چھوٹے جہاز بڑے کارنامے
۹۰	۱۰۔ ستاروں سے آگے.....!
۹۹	۱۱۔ ”پانچ سو میں چار“
۱۱۱	۱۲۔ سفید خرگوش
۱۲۲	۱۳۔ ”دستِ یارِ دشمن؟“
۱۳۳	۱۴۔ خفیہ مشن
۱۴۵	۱۵۔ ایک راستہ چین کا —!

۱۹۷۵ء

دو ہزار

تیسری بار

تعداد

قیمت

مطبوعہ فیروز سنز لمیٹڈ لاہور، باہتمام عبدالحمید خاں پرنٹر پبلشر

## ونسٹن چرچل کا تاریخی فرار

۱۸۹۹ء کی بات ہے جب برطانیہ کے شہرہ آفاق وزیر اعظم سر ونسٹن چرچل محض مسٹر ونسٹن چرچل تھے اور انگلستان کے مشہور روزنامے مارننگ پوسٹ کے نامہ نگار کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔

اتفاق سے اسی زمانے میں جنوبی افریقہ میں برطانیہ کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے خلاف بغاوت شروع ہو گئی۔ بوٹرباغیوں نے برطانوی افواج پر پے درپے منظم حملے کر کے ان کے چھکے چھڑا دیے۔ قریب تھا کہ انگریزوں کے قدم اکھڑ جاتے لیکن ان کی زبردست سیاسی سوجھ بوجھ اور فوجی مہارت نے باغیوں کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ جھمسان کی جنگ ہوئی لیکن آخری فتح تاج برطانیہ کو ہی نصیب ہوئی۔

اس جنگ کی خبریں بھیجنے کے لیے "مارننگ پوسٹ" نے مسٹر چرچل کو منتخب کیا۔ ان کی عمر اس وقت کوئی پچیس برس کے لگ بھگ تھی۔ مگر انھوں نے ایک مہم جو طبیعت پائی تھی چنانچہ اس خدمت کو بخوشی قبول کر لیا اور کیپ ٹاؤن روانہ ہو گئے۔

تھوڑی ہی دیر میں یہ سب گرفتار کر لیے گئے اور بوڑھا ہی ان سب کو لے کر دارالحکومت پر ٹیوریا روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر ان کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا۔ عام آدمیوں اور سپاہیوں کو شہر کے باہر بس کوڑس کے کیمپ میں رکھا گیا، افسران کو شہر کے بیچوں بیچ ایک اسکول کی عمارت میں قید کر دیا گیا۔ مسٹر جرجیل بھی ان افسران کے ساتھ تھے۔

اسکول کی عمارت کے چاروں طرف کھیل کا ایک میدان تھا، جو دو طرف سے لوہے کی جالیوں اور دو طرف سے فولادی چادروں میں گھرا ہوا تھا، یہ چادریں کوئی دس فیٹ اونچی تھیں۔ چاروں طرف فوج کا سخت پہرہ تھا اور شہر کے ہر گلی کوچے میں فوج کے لوہو جانٹل رہے تھے۔

یہ قیدی جیسے ہی یہاں پہنچے، انہوں نے فرار کی ترکیبیں سوچنی شروع کر دیں۔ خصوصاً مسٹر جرجیل کی آزاد روح سب سے زیادہ مضطرب تھی۔ انہیں سب سے زیادہ تکلیف اس بات کی تھی کہ سرمنڈاتے ہی اگلے پڑے۔ جس مقصد سے وہ محاذ جنگ پر آئے تھے اُسے شروع بھی نہ کر پائے تھے کہ قید کر لیے گئے۔ چنانچہ وہ ہر قیمت پر یہاں سے بھاگ نکلنا چاہتے تھے۔ دوسرے لوگ بھی اسی فکر میں تھے کہ کوئی سبیل ایسی نکل آئے کہ اس قید سے کلو خلاصی ہو۔ حفاظتی پولیس کو رشوت دینا ممکن نہ تھا۔ بیوڈ وہاں اس وقت شدید مہنگائی تھی اور پولیس نے رشوت کے نرخ بڑھا رکھے تھے۔ پھر ان لوگوں کے پاس

”کیپ ٹاؤن“ سے انہیں ایک ٹرین کے ذریعہ شیولے بھیج دیا گیا۔ یہ ٹرین بھی پرانے زمانے کی ایک یادگار تھی اور دشمن کے علاقے سے ہو کر گزرتی تھی۔ اس میں انجن کے علاوہ پانچ ڈبے اور ایک توپ لگی ہوئی تھی جو فوجی جوان اس ٹرین کے ذریعے سفر کر رہے تھے ان کی کمان کیپٹن بالڈین کے ہاتھ میں تھی۔ یوں تو اس ٹرین کو کوئی خطرہ نہ تھا کیونکہ گاڑی پر رائفل کی گولی اثر انداز نہ ہو سکتی۔ لیکن دشمن کو کمزور سمجھنا نادانی ہے۔ اس نے ٹرین کو روکنے کے سارے انتظامات پہلے ہی سے مکمل کر رکھے تھے۔

ٹرین جونی شیولے پہنچی، ڈرائیور کو سامنے سے کچھ بوڑھا غی دستے نظر آ گئے اور کیپٹن بالڈین کے حکم پر گاڑی کو واپسی کا حکم دے دیا گیا۔ ڈرائیور نے پوری قوت سے انجن کو پیچھے کی طرف چلانا شروع کر دیا مگر بھی ٹرین کچھ ہی دور گئی ہوگی کہ اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ ٹرین ایک بہت بڑے پتھر سے جا ٹکرائی۔ یہ پتھر دشمن نے پٹری کے بیچوں بیچ ڈال دیا تھا۔ اتفاق کی بات کہ انجن گاڑی کے بیچ میں تھا اس لیے پٹری سے نہ اتر سکا البتہ دو ڈبے ٹوٹ چکے اور ایک طرف جا پڑے۔ ٹرین کے عملے نے بڑے حوصلے کے ساتھ زخمیوں کو نکالا، گاڑی پر ڈالا، ڈبوں کے کانٹوں کو ملایا اور ڈرائیور نہایت پھرتی کے ساتھ تین ڈبے لے کر نکل آیا۔ دو ڈبے اور اس کے مسافر ٹری بے چارگی کے عالم میں وہیں رہ گئے جن میں مسٹر جرجیل بھی تھے۔

دھرا ہی کیا تھا جو کسی کو رشوت دیتے۔ ایک مشکل یہ بھی تھی کہ چھوٹیں تو جہاں کہاں؟ نیٹال یا کیپ کا لونی جانا بے سود تھا کیونکہ وہاں جانے کے لیے دشمن کا علاقہ پار کرنا پڑتا، مشرق کی طرف پرتگالی علاقے تھے، وہاں جانا بھی خطرے سے خالی نہ تھا کیونکہ ادھر بھی تین سو میل کا سفر انجان راستے میں سے کرنا پڑتا۔ آخری امید خلیج ڈیلا گوا کے راستے سے تھی کیونکہ وہاں ایک ریلوے اسٹیشن موجود تھا۔

کیپٹن بالڈین جو فوجوں کے کمانڈر تھے وہ قیدیوں میں شامل تھے اور ننگ بنانے کی سوچ رہے تھے۔ لوگوں نے انہیں اپنی اپنی سمجھ کے مطابق مشورے دیے۔ لیکن مسٹر چرچل نے بڑے عزم و حوصلے کا مظاہرہ کرتے ہوئے فیصلہ کیا کہ پہرے داروں کی نظر بچا کر بھاگ لیا جائے اور دیوار پھاند کر قید خانے سے فرار ہو جائیں۔ ان کے ایک اور دوست نے بھی اس منصوبے سے اتفاق کیا۔ چنانچہ دونوں نے مل کر جملہ تفصیلات طے کیں۔ دونوں نے سب سے پہلے اسکول کی عمارت اور اطراف کے گلی کوچوں پر نظر دوڑائی۔ سامنے کی سڑک وہاں سے صاف نظر آتی تھی، کچھ دُور پر ایک چوراہا تھا جو بجلی کی تیز روشنی سے جگمگاتا تھا۔ رات کے وقت دو پہرے دار سڑک سے چوراہے کی طرف ٹہلتے ہوئے پہرہ دیتے تھے جب وہ چوراہے کی طرف جاتے تو اسکول کی عمارت کی طرف ان کی پیٹھ ہوتی۔ لیکن جب واپس آتے تو رخ اسکول کی طرف ہوتا۔ ان لوگوں نے سوچا کہ کیوں نہ اس وقت دیوار پھاندی جائے جب پہرہ داروں کا رخ چوراہے کی طرف ہو۔ شہر سے نکلنے کے

بعد آگے بڑھنا اتنا مشکل کام نہ تھا۔ باہمی مشورے سے انہوں نے یہ بھی طے کیا کہ دن میں کہیں ٹھپ جابا کریں گے اور رات میں سفر کریں گے کیونکہ سفر کافی طویل تھا اور خطرہ اس وقت تک باقی تھا جب تک وہ پرتگالی علاقوں میں پہنچ نہ جاتے۔

مسٹر چرچل کے پاس صرف ۵۔ پونڈ اور چاکلیٹ کی چند ٹکیاں تھیں۔ انہوں نے سوچا کہ راستے میں کسی گاؤں کی دکان سے کھانے پینے کا سامان لے لیں گے۔ ان کے دوست کے پاس ایک قطب نما، ان علاقوں کا ایک نقشہ، تھوڑا سا بھنا ہوا گوشت اور کچھ فیوٹ کی ٹکیاں تھیں۔ قطب نما اور نقشہ اس لیے لینا ضروری تھا کہ راستے بالکل انجانے تھے اور کسی سے پوچھنا خطرے سے خالی نہ تھا اس لیے سفر جاری رکھنے کے لیے ان چیزوں کا ہونا ضروری تھا۔ فرار کے لیے ۱۱ دسمبر کی شام طے ہوئی اور انہوں نے پروگرام بنایا کہ جب رات کے کھانے کی گھنٹی بجے گی تو دونوں نکل لیں گے۔

۱۱ دسمبر کا دن ان کے لیے عجیب اُمید و بیم کا دن تھا۔ صبح سے ہی پریشانی اور سرایمگی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ جہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ خدا خدا کر کے دن تمام ہوا اور رات کے کھانے کی گھنٹی بجی تو دونوں نے ایک دوسرے کو بکھیا۔ ایک طرف عزم کے تہور تھے، تو دوسری طرف خوف کے گڑھے۔ آخر وہ دیے پاؤں آگے بڑھے اور کسی نہ کسی طرح لوہے کی دیوار تک پہنچے۔ پھر انہوں نے دیوار پر آہستہ سے اچک کر

دوسری طرف دیکھا اور ان کے پیرتلے سے زمین نکل گئی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ دوپہرے داروں میں سے ایک تو اسی دیوار کے سہارے کھڑا ہے، دوسرا غائب ہے۔ ان کا تمام پروگرام درہم برہم ہو گیا، وہ اُلٹے پاؤں واپس آگئے اور بھاگنے کا پروگرام دوسرے دن پر ملتوی کر دیا۔

جیسے تیسے کر کے ہم گھنٹے کٹے۔ دوسرے دن شام آئی تو کل کی طرح آج پھر وہ دیوار تک آئے۔ تھوڑی دیر تک دیوار کے پاس کھڑے رہے اور آہٹ لیتے رہے لیکن کوئی آواز نہ آئی تو مسٹر چرچل کو کچھ اطمینان ہوا۔ وہ دوڑ کر ایک جہو ترے پر چڑھ گئے اور وہاں سے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ سنتری پہرہ دے رہے تھے جب دونوں سنتری باتیں کرتے ہوئے دوسری طرف جانے لگے تو مسٹر چرچل بڑی پھرتی کے ساتھ دیوار پر چڑھ گئے اور اچانک دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ اس وقت پہرہ دار صرف ۱۵ گز کے فاصلے پر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ مسٹر چرچل کا دوسرا ساتھی ان کی پھرتی کا ساتھ نہ دے سکا، وہ دوسری طرف ہی رہ گیا۔ ادھر مسٹر چرچل کچھ دیر تک اپنی جگہ کھڑے رہے لیکن پکڑے جانے کے خوف سے وہیں لیٹ گئے۔

چودھویں کا چاند آسمان پر چمک رہا تھا۔ ہر طرف اُجالا تھا، تاہم باغ میں اونچے اونچے درختوں کے سائے چھپنے کے لیے جگہ مہیا کر رہے تھے لیکن اس کے ایک کنارے پر ایک کوٹھی بنی تھی جس کی

کھڑکیوں کے شیشوں سے روشنی چھین چھین کر باہر نکل رہی تھی۔ کبھی کبھی کسی آدمی کی نقل و حرکت بھی کھڑکی میں سے صاف نظر آ جاتی۔ مسٹر چرچل یہ تمام منظر اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔ دل میں یہ خیال بار بار آ رہا تھا کہ کہیں کوٹھی والے آدمی نے انھیں دیکھ نہ لیا ہو لیکن مڑا کیا نہ کرتا۔ اپنی جگہ بے حس و حرکت پڑے رہے۔ اچانک اس کوٹھی سے وہی آدمی نیچے آگیا اور تیزی کے ساتھ اُن کی طرف آنے لگا۔ اب تو ان کی حالت غیر ہونے لگی۔ طرح طرح کے ٹسکوک و شبہات ان کے عزم و ارادے کا امتحان لینے لگے۔ وہ آدمی مسٹر چرچل سے کوئی دس قدم کے فاصلے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ انھوں نے اپنی سانس روک لی لیکن یہ اطمینان ہا کہ اُس نے ابھی تک ان کو دیکھا نہیں۔ اسی اثنا میں ایک اور آدمی اسی کوٹھی سے برآمد ہوا۔ وہ بھی پہلے والے آدمی کے پاس آ کر کھڑا ہوا۔ دونوں نے کچھ بات کی۔ پھر سگارا سلگایا اور ٹہلتے ہوئے دوسری طرف چلے گئے۔ اُنھیں کے مڑتے ہی اچانک ایک بلی کو دی جس کی وجہ سے بیٹوں میں کھڑکھڑاہٹ پیدا ہوئی۔ جاتے جاتے اُن آدمیوں نے مڑ کر دیکھا لیکن بلی کو دیکھ کر مطمئن ہو گئے اور آگے بڑھ گئے۔ اب مسٹر چرچل کی جان میں جان آئی۔ مسٹر چرچل کو وہاں لیٹے کوئی ایک گھنٹہ گزر چکا تھا مگر اب انھیں کافی اطمینان ہو گیا تھا پھر بھی وہ اپنی جگہ سے اٹھے نہیں۔ اسی دوران دیوار کے پیچھے سے کوئی آواز سنائی دی۔ انھیں خیال ہوا کہ ذرا چل کر یہ آواز سنائی جائے۔ چنانچہ وہ پیٹ کے بل گھسٹتے ہوئے دیوار



بچا بچا کر کھلتے رہے۔ اسی اثناء میں انہیں خیال آیا کہ اگر وہ یونہی تین سو میل کا فاصلہ اپنی ٹانگوں پر بھروسہ کر کے طے کرتے رہے تو گرفتار ہو جانا یقینی ہے۔ کیا اچھا ہو کہ ٹرین سے سفر کیا جائے۔ ابھی یہ سوچا ہی تھا کہ سامنے ریلوے اسٹیشن کی روشنی نظر آئی اور کچھ قریب پہنچنے پر معلوم ہوا کہ کوئی چھوٹا سا اسٹیشن ہے جس پر ٹرین کھڑی ہوئی ہے۔ ٹرین دیکھ کر انہیں بڑی خوشی ہوئی۔ وہ اب آگے بڑھنے کے بجائے وہیں ایک گڑھے میں چھپ کر ٹرین کا انتظار کرنے لگے۔ اسٹیشن پر جانا انہوں نے مناسب نہ سمجھا اور سوچا کہ جب ٹرین رکتی ہوئی ان تک پہنچے گی تو وہ اچھل کر اس میں سوار ہو جائیں گے، آخر اسپید بکڑنے میں ٹرین کو کچھ نہ کچھ فاصلہ تو ضرور طے کرنا ہوتا ہے؟ ابھی وہ یہ سوچ رہے تھے کہ ٹرین نے سیٹی دی اور انجن کے سامنے کی بڑی تچی کی روشنی تیز ہونے لگی۔ چند ثانیوں میں ٹرین ان کے سامنے تھی۔

اب انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ گڑھے سے نکل کر ایک جست لگائی اور دوسرے لمحے وہ گاڑی کے پاؤں پر کھڑے تھے۔ یہ ایک مال گاڑی تھی۔ ہر بوگی میں خالی بوریوں کے انبار لگے تھے۔ اوپر سے کوئلے کی راکھ پڑی تھی۔ چرچل صاحب انہی بوریوں کے اندر گھس گئے۔ ایک گونہ اطمینان نصیب ہوا۔ کم از کم یہ تو یقین ہو گیا کہ یہ ٹرین بہت دُور نکال لے جائے گی اور دوبارہ گرفتاری کا خطرہ قدرے کم ہو جائے گا۔ فوسنی سکون ملتے ہی انہیں نیند آگئی۔ وہ خوب مزے میں ٹانگیں پھیلا کر

کے نزدیک جا پہنچے اور کان لگا کر سننے لگے۔ ان کے دو فوجی ساتھی باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے آواز پہچان لی اور کھانس کر اپنے وجود سے مطلع کیا۔ دونوں افسران سمجھ گئے کہ مسٹر چرچل ابھی یہیں ہیں۔ ان میں سے ایک نے بلند آواز میں کہا: لوٹ آؤ۔ ابھی کوئی خطرہ نہیں ہے۔ پہرہ داروں کو شبہ ہو چکا ہے۔ یہ آواز اسی ساتھی کی تھی جو مسٹر چرچل کے ساتھ فرار ہونے والا تھا۔ عزم دارا دے کے اس پکیر نے جواب دیا مجھے تمہاری ضرورت نہیں میں اکیلا سی پلا جاؤں گا۔

یہ کہہ کر وہ اک دم کھڑے ہو گئے اور آگے بڑھنے لگے۔ ایک پہرہ دار ان سے پیاس کز کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ وہ اس سے بچتے ہوئے کوٹھی کے پاس سے نکل بیٹے۔ یہ مسٹر چرچل کی زندگی کا ایک حیرت ناک تجربہ تھا۔ دشمن کا علاقہ، آدھی رات اور قید سے فرار۔ راستے اور گلی کا کوئی اندازہ نہ تھا اور یہ بھی یقین تھا کہ دو تین گھنٹوں کے اندر اندران کے خلاف زبردست شور و غوغا بلند ہونے والا ہے۔ وہ اس طرح راستے پر چلتے رہے، گویا ٹہل رہے ہوں۔ دل میں خوف تھا لیکن چہرے پر اطمینان کے آثار! تقریباً نصف میل چلنے کے بعد انہیں ریل کی پٹریاں دکائی دیں اور وہ بغیر سوچے سمجھے ریل کی پٹریوں کے ساتھ ساتھ چل دیے۔ اب انہیں اطمینان ہو چکا تھا کہ کوئی انہیں شناخت نہ کر سکے گا۔ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ ریلوے والوں کی چوکیاں بنی تھیں اور ہر ٹرین پر چوکیدار بھی موجود تھے۔ وہ ہر چوکی سے دُور بیٹھ کر آگے بڑھتے اور نظر

اس وقت یہ پیدل سفر مسلسل پانچ دن جاری رہا۔ دن کو کہیں ٹہرہتے، رات کو سفر جاری رکھتے۔ بھوک سے حالت اتر، ہو رہی تھی، پاؤں رکھتے کیس تھے پتہ تا کہیں تھا کسی چوکی سے بچنے کے لیے ذرا گھوم کر راستہ طے کرتے تو ابھی دلدل میں پھنس جاتے اور اس طرح کپڑے بھی لت پت ہو جاتے۔ غرض اسی کس پری کے عالم میں پانچویں دن ٹڈل برگ پہنچے۔ یہاں اتفاقاً دو انگریزوں سے ملاقات ہو گئی جو ایک کوٹلے کی کانٹیں افسر تھے۔ انھوں نے نہایت رازدارانہ طریقے سے ڈیلا گوا بے جانے والی ٹرین تک پہنچو ادیا۔

ادھران کے فرار کے خلاف بڑا شور و غوغا ہوا۔ تمام ریلوے اسٹیشنوں کو ان کا مفصل حلیہ اور تصویریں بھیج دی گئیں۔ نئی افور گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیے گئے۔ قید خانے کے وہ افسران جو مسٹر چرچل کو صورتاً جانتے تھے، فوری طور پر سرمدی اسٹیشن کو ماٹی پورٹ بھیج دیے گئے اور یہ حکم دے دیا گیا کہ چرچل جس حالت میں بھی ہوں فوری گرفتار کر کے واپس لائے جائیں۔ افواہیں بھی خوب خوب اڑیں۔ بعض حلقوں میں یہ مشہور ہو گیا کہ وہ عورت کے بھیس میں فرار ہوئے ہیں کسی نے کہا کہ پولس کی یونی فارم میں نکل گئے ہیں بعض لوگ یہ کہتے ہوئے بھی سنے گئے کہ وہ پریٹوریہ میں روپوش ہیں غرض جتنے منہ تھے اتنی باتیں۔ اور ادھر یہ بندہ خدا آگے ہی بڑھتا جا رہا تھا۔ چھٹے دن انھیں ڈیلا گوا بے جانے والی ٹرین مل گئی۔ یہ ٹرین

سوئے۔ جب آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ ابھی سورج طلوع ہونے میں کافی وقت باقی ہے۔ اب انھیں احساس ہوا کہ دن نکلنے سے پہلے ٹرین چھوڑ دینی چاہیے ورنہ مال گاڑی میں پہچان بیا جانا ممکن ہے۔ چنانچہ جس طرح چڑھے تھے اسی طرح اتر بھی گئے۔ ہاں مال گاڑی اپنی پوری رفتار میں تھی اس لیے کودنا کافی ہنگامہ پڑا۔ بدن کا جوڑ جوڑ ہل گیا۔ مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ چوٹ نہیں آئی۔

جب ذرا حواس ٹھکانے ہوئے تو پتا چلا کہ وہ ایک ایسی وادی میں ہیں جو چاروں طرف سے گھری ہوئی ہے۔ اُن کی حالت نہایت خستہ ہو رہی تھی۔ پچھلے ماہ کی قید، رات کا سفر اور ٹرین سے کودنے کی تکلیف ان سب باتوں نے اُن کے ہاتھ پاؤں شل کر دیے تھے۔ اور یہ اُن ہی کی ہمت تھی جس کی بدولت وہ چلے جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر ایک تالاب نظر آیا۔ پک کر وہاں پہنچے، خوب پیٹ بھر کر پانی پیا اور ایک اونچی پہاڑی پر چڑھ کر چاروں طرف نظر دوڑانے لگے۔ مغرب کی جانب ایک چھوٹا سا شہر نظر آیا جس کے مکانوں کی چھتیں ٹین کی تھیں۔ وہ بھوک سے نڈھال ہو رہے تھے لیکن گرفتاری کے خوف سے شہر جانے کی ہمت نہ پڑی۔ کچھ چاکلیٹ بچے کھچے پڑے تھے انھی کو صبر ٹھک کے ساتھ کھالیا اور سارا دن اسی مادی میں گزار دیا۔

اندھیرا ہوتے ہی وہ بچہ اپنے سفر پر دوبارہ روانہ ہو گئے۔ اب کے انھیں کوئی ٹرین نہ ملی۔ لیکن پھر وہ پٹری کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔

## ۲۔ ترکی کے قیدی

”شیب و فراز کس کی زندگی میں نہیں ہوتے، پھر میری زندگی ان سے کیونکر خالی ہو سکتی ہے! البتہ میرے یہاں خوش بختی اور حرام نصیبی دونوں اپنے نقطہ عروج پر ملتے ہیں۔ میری کہانی دل چسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ یہ فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے کہ میں کس حد تک کامیاب رہا ہوں۔ کہانی شروع کرنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اپنا مختصر سا تعارف کرانا چلوں۔“

میں نے پہلی جنگ عظیم سے قبل ہندوستان کے صوبہ سرحد میں جو نیرافسر کی حیثیت سے فوج کی ملازمت اختیار کی تھی اور مشہور زمانہ جنگال لانسر میں شامل ہو گیا تھا۔ اسی دوران پہلی عالمگیر جنگ چھڑ گئی۔ جنگ کی داستان بڑی طویل ہے جس کے ذکر کا یہ محل نہیں۔ مختصراً یہ کہ سن پندرہ کے آغاز میں مجھے ایک ہندوستانی دستے کے ترجمان کی حیثیت میں آربینس (ORLEANS) بھیج دیا گیا۔ یہاں میری قسمت کا ستارہ چمکا۔ مجھے ترقی دے کر شاہی ہوا بازی کے ادارہ کا مقرر بنا دیا

سائڈنگ میں کھڑی تھی۔ اس کے ڈبوں میں بھی بوریاں بھری تھیں البتہ یہ بوریاں خالی نہ تھیں ان میں کوئی نرم نرم چیز تھی۔ وہ آہستہ آہستہ زور لگاتے ہوئے ڈبے کے فرش تک پہنچ گئے۔ بھاتے تھے کہ کچھ دیر آرام کر لیں لیکن ایک توڑانسوال کی شدید گرمی دوسرے یہ خوف کہ سرحدی اسٹیشن کو مانی پورٹ پر ہر ڈبے کی تلاشی لی جائے گی، وہاں سے بچ نکلنا بہت مشکل ہے اس لیے آنکھ نہ لگی۔ اور جب کو مانی پورٹ آیا تو ان کی پریشانی واقعی بڑھ گئی۔ ٹرین کو ۱۸ گھنٹوں کے لیے ایک سائڈنگ میں کھڑا کر دیا گیا۔ ہر ڈبے کی تلاشی لی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کے دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہوتی چلی گئیں۔ جب ان کے ڈبے کی تلاشی کا نمبر آیا تو ان کا مارے خوف و دہشت کے بُرا حال تھا مگر اللہ نے بڑی مدد کی۔ پولیس والوں نے تہ پال اتارا اور بس اوپر ہی اوپر ڈبے کو دیکھ لیا۔

بالآخر ٹرل برگ چھوڑنے کے ڈھائی دن بعد اور پریٹوریا سے چلنے کے ساڑھے آٹھ دن بعد ٹرین ڈیلا گوا بے میں داخل ہو گئی۔ اس طرح مسٹر چرچل کا تاریخی فراز کامیاب ترین سیاسی زندگی کا ایک دیباچہ بن گیا!

اس کے باوجود مجھے اپنی کامیابی کا مکمل یقین تھا۔ چنانچہ ہم کے بارے میں سوچنے کے بجائے میں یہ خیالی پلاؤ پکاتا رہا کہ بغداد سے واپسی پر میرے بازو پر ایک نیتہ اور بڑھ چکا ہوگا اور مجھے محاذ جنگ سے بلا کر ٹریننگ اسکول میں تعینات کر دیا جائے گا جہاں آرام ہی آرام ہوگا۔

۱۳ نومبر کی صبح کو میرا جہاز آسٹریلوی گورے کے ساتھ ہوا میں تیرنے لگا۔ مطلع بالکل صاف تھا۔ اقلونی کے مقام پر ترکی کی چوکیوں کی روشنیاں صاف نظر آرہی تھیں۔ ہمارے جہاز کی گھڑ گھڑاہٹ سے دشمن کے مورچوں میں ایک کھلسلی مچ گئی۔ فوجی جوان آنکھیں ملتے ہوئے ہمارے جہاز کی طرف گھورنے لگے۔ کھیت، پہاڑ، فوجی خندقیں، انسان اور گھوڑوں کی قطاریں تیزی کے ساتھ نیچے گزر رہی تھیں۔ یہ بات صاف ظاہر تھی کہ دشمن چونکا ہے اور زبردست تیاریوں میں مصروف ہے۔ میری خواہش تو یہ تھی کہ دشمن کی پوری پوری معلومات حاصل کی جائیں لیکن اس کے لیے مجھے ایک دن مزید انتظار کرنا پڑتا جو میں کسی صورت نہ چاہتا تھا۔ اب جہاز سے وہ سڑک صاف نظر آنے لگی جو فلو جہ کو بغداد سے ملاتی تھی۔ دراصل یہی سڑک ہماری منزل تھی کیونکہ اسی سڑک کے کنارے کنارے ٹیلی گراف کی لائن تھی اور اسی کو کاٹنا ہمارے پروگرام میں شامل تھا۔ بغداد کے قریب پہنچ کر مجھے ابتدائی پروگرام میں تبدیلی کرنی پڑی، کیونکہ وہاں فوج کی زبردست گھما گھمی تھی۔ گھوڑے اور ادنیٰ سواروں کے قافلے سیم حل پھر رہے تھے لہذا ہم نے اپنا جہاز بغداد سے مغرب کی طرف یگانہ کی سمت

گیا۔ یہ ایک گز میٹڈ عہدہ تھا۔ میری خوشیوں کی کوئی انتہا نہ رہی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ عہدہ میرے لیے مصائب کا پیش خیمہ ثابت ہوگا! واقعہ یہ ہے کہ مجھے اور ایک آسٹریلوی ہوا باز کو اس کام پر تعینات کیا گیا کہ ہم دونوں بغداد جا کر وہاں کے مضافات میں پھیلی ہوئی ٹیلیگراف کی لائنیں کاٹ دیں تاکہ بغداد دوسرے علاقوں سے منقطع ہو جائے اور دشمن کی فوجیں وہاں تک نہ پہنچ سکیں۔ ہم جہاں پر مقیم تھے وہاں سے بغداد کا فاصلہ سو میل سے کسی حالت میں کم نہ تھا۔ اتنے طویل سفر کے لیے ہمیں کافی تیاریاں کرنی تھیں۔ آمدورفت میں دو سو میل کی مسافت تھی۔ ایک دشواری یہ بھی تھی کہ جس جہاز پر ہمیں سفر کرنا تھا وہ تین گھنٹے سے زیادہ پرواز نہ کر سکتا تھا چنانچہ کچھ زائد بیڑول اور تیل لیا، بعض فالتو پرزے بھی ساتھ لے لیے اور ہم روانگی کے لیے تیار ہو گئے۔ جس دن ہماری روانگی تھی اس سے ایک دن قبل شام کے کھانے کے بعد میں نے کوئی ایک گھنٹہ انجنیئروں کے ساتھ گزارا کیونکہ مجھے سب سے زیادہ فکر اپنے جہاز کی تھی کہ مشین ہی تو ہے اگر خراب ہو گئی تو ہماری خبر نہیں۔ بہر حال تمام کل پرزوں کی جلچ کی گئی۔ آتش گیر مادے بھی ساتھ لے لیے گئے اور پورا اطمینان کرنے کے بعد میں سونے چلا گیا۔ صبح جلد ہی آنکھ کھل گئی۔ پتا نہیں کیوں مجھے ایک اطمینان سا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ دشمن کے علاقے میں دو مرتبہ جہاز آنا پڑے گا اور میں جو کام کرنے کے لیے نکل رہا ہوں وہ بجائے خود بڑا خطرناک اور مخدوش ہے

موڑ لیا۔

عظیم بغداد کا جاؤوٹی شہر کھجور کے درختوں کے جھنڈ میں دریائے فرات تک پھیلا ہوا تھا اور ایک نہایت دلآویز نظارہ پیش کر رہا تھا۔ شہر کے دو دریا، پانچ جھیلیں اطراف میں پھیلے ہوئے پہاڑوں کے وسیع سلسلے اور سب سے بڑھ کر شمال کی جانب کاظمین کے سنہرے گنبدوں کی قطاریں آنکھوں کو چکا چوند کر رہی تھیں مگر بد قسمتی سے تین چار ہزار اونٹوں کے طویل قافلے دارالحکومت کی طرف بڑھتے نظر آ گئے۔ ایسا معلوم ہوا کہ برص کے داغ ہیں جو پھیلتے چلے جا رہے ہیں۔

یہ عالم میں جو راستہ سب سے زیادہ سفسان نظر آیا ہم نے جہاز کو ادھر ہی موڑ لیا۔ یہ جگہ نمرود کا مقبرہ کہلاتی ہے۔ یہاں پہنچ کر جہاز کو اتارا اور تار کے کھیموں کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ اب ہمارا ہوائی جہاز زمین پر چل رہا تھا مگر ابھی ہم کچھ ہی دور چلے ہوں گے کہ اچانک مجھے تیل بھرا کپڑا اٹھانے کے لیے جھکنا پڑا۔ جھکتے ہی ایک زوردار دھماکہ ہوا اور جہاز کا انجن بند ہو گیا۔ میں پہلے تو کچھ خوفزدہ ہوا لیکن بعد میں بہت کر کے جہاز سے زمین پر کود پڑا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ جہاز کا بایاں بازو تار کے کھیمے سے ٹکرا کر چور چور ہو گیا ہے اور جہاز بیکار ہو گیا۔ اب زمین پر پیدل سفر ہمارا مقدر بن گیا تھا۔ اس موقع پر یہ بتانا از بس ضروری ہے کہ اس حادثے میں ہمارے ہوا باز کی کوئی خطانہ تھی کیونکہ وہاں کی زمین ہموار تھی جہاز اچانک نیز ہوا کے چلنے سے غیر معمولی رفتار میں آگیا اور

کھیمے سے جا ٹکرایا۔ خیر جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب ہمارے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ جس مقصد کے لیے یہاں آئے ہیں اور اتنی مصیبت مول لی ہے، اسے پورا کیا جائے۔

چنانچہ میں نے گورے ہوا باز سے کہا کہ تم جا کر جہاز کو چلانے کی کوشش کرو میں اپنا کام کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر میں دوسرے ٹیلی گراف کے کھیمے کی طرف بڑھا اور اس کے اوپر تیل بھرا ہوا سوت کا لچھا ڈال کر آگ لگا دی۔ چند ہی لمحوں میں کھیمہ ٹوٹ کر نیچے آگرا۔ اتفاق سے کچھ عرب ادھر آنکلیے انھوں نے جو ہمیں دیکھا تو اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ تھوڑی ہی دیر میں چاروں طرف سے گھڑ سواروں کی فوج آتی نظر آنے لگی۔ میں نے کسی خطرے کی پروا کیے بغیر دوسرے کھیمے پر آگ لگا دی اور ٹوٹے ہوئے کھیموں میں شعلے بھڑکنے لگے۔ دشمن کے حوصلے پست کرنے کے لیے ہمارے ہوا باز نے جہاز پر سے ہی ہوائی فائر شروع کر دیے۔ نہایت خوفناک منظر تھا۔ ادھر آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ دوسری طرف عربوں کی فوج نہایت شد و مد سے حملے کر رہی تھی۔ میں نے بہر حال اپنا کام ختم کر لیا تھا۔ ٹیلیگراف کے تار اور کھیمے ٹوٹ پھوٹ کر ٹھکانے لگ چکے تھے۔ لیکن ٹیلیگراف کے تاروں کے کٹنے کے ساتھ ساتھ ہماری شامت بھی آگئی۔ ہم دونوں کو عرب حملہ آوروں نے آیا اور ہمارے دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔ موت سامنے رقص کرتی دکھائی دے



ایک سپاہی کے منہ پر شدید ضربوں کے نشانات تھے اور ایک ہاتھ ٹوٹ کر کھال کے سہارے لٹک رہا تھا۔ کچھ دور تک گھسٹنے کے بعد وہ بھی ختم ہو گیا۔ دوسرا واقعہ بھی انہی لوگوں سے متعلق ہے۔ میں نے ایک سنتری کو کچھ دے دلا کر راضی کیا کہ ان مصیبت زدہ لوگوں میں سے دو آدمیوں کو جن کی حالت بہت ہی نازک ہے کچھ کھانا پہنچا دے۔ سنتری راضی ہو گیا۔ اور اس نے کھانے کا بندوبست کر دیا۔ ان لوگوں نے بتایا کہ انہیں اس قدر تنگ و تنگ کوٹھڑی میں رکھا گیا ہے کہ وہ پاؤں پھیلا کر لیٹ بھی نہیں سکتے۔ کھانے کو صرف روٹی اور پانی ملتا ہے۔ نہانے دھونے کا کوئی انتظام نہیں۔ ابھی ایک مصیبت زدہ اپنا حال سن رہا تھا کہ دوسرا کھانا کھاتے کھاتے بے ہوش ہو گیا۔ آسٹریلوی گورے نے اسے اپنی پیٹھ پر لا کر اس کال کوٹھڑی تک پہنچایا اور جب تک وہ ہوش میں نہیں آگیا اس کے پاس ہی رہا۔ لیکن افسوس کہ چند ہی لمحوں بعد اس کے جسم سے جو نہیں اُبلنے لگیں۔ کہتے ہیں کہ مرتے ہوؤں کو حشرات الارض بھی نہیں پوچھتے۔

ہم دونوں دوسرے پریشان حالوں کی مدد کے پروگرام ہی بناتے رہے کہ ہمارے تباہی کا حکم آگیا پہلے یہیں ایلپو (ALEPO) بھیجا گیا پھر وہاں سے اناطولیہ کے وسط میں واقع آفیون کا رہ حصار منتقل کر دیا گیا۔

راستے میں میرے ذہن میں خیال آیا کہ فرار کی ایک کوشش کیوں

رہی تھی اور ہم اس کا فہم بن جانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ عرب سپاہیوں نے ہمارے نزدیک پہنچ کر آپس میں کھسکھس شروع کر دی۔ کسی کا اصرار تھا کہ ہم دونوں کے سر اتار لیے جائیں لیکن بعض کہہ رہے تھے کہ انہیں ترک کرنا پڑے گا۔ پاس زندہ لے چلو تاکہ ان کی گرفتاری پر کچھ انعام مل جائے۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی تھیں کہ ترک گھوڑا سو سپاہیوں کا ایک دستہ ادھر آ نکلا۔ انہوں نے ہمیں عرب قبائل کے جنگل سے چھڑا لیا اور اپنے ہمراہ بغداد لے گئے۔ بغداد پہنچ کر یہ عالم تھا کہ لوگوں کے ہجوم ہمیں نفرت و حقارت سے دیکھ رہے تھے۔ بعض ہمارے منہ پر تھوکنے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ قلعہ مختصر یہ کہ ہمیں موصل کے قلعہ میں قید کر دیا گیا اور دو سال کا طویل عرصہ دنیا کے ہنگاموں سے دور قید و بند کی صعوبتوں میں گزر گیا۔

قید کے حالات ناقابل بیان ہیں۔ ظلم، بربریت، درندگی اور بد اخلاقی کی کوئی ایسی سزا نہ تھی جو وہاں نہ ملی ہو۔ میں اس وقت صرف دو واقعوں پر اکتفا کروں گا کیونکہ اگر ان کو بھی نظر انداز کر دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ چودہ ہزار قیدیوں میں سے صرف تین ہزار کی واپسی کے سانچے پر مکمل پردہ ڈال دیا جائے۔

ایک موقع پر کچھ انگریز سپاہی اس قدر ناگفتہ بہ حالت میں نظر آئے کہ رُوح کا نپ اُٹھی۔ انسان کیا تھے، محض ڈھانچے تھے جو اپنے ساتھ تین سپاہیوں کی لاشیں بھی اٹھائے ہوئے تھے۔

ہم نے اپنے اپنے جوتے اتار لیے۔ کوئی دس گز کپڑا کر سے باندھا، جیب میں چاکلیٹ وغیرہ بھر لیے، دوسرا ضروری سامان لیا اور کمرے کا لیمپ بجھا دیا لیمپ بجھانے کے دو فائدے تھے، ایک تو یہ کہ سنتری سمجھیں گے کہ ہم سونے جا رہے ہیں، دوسرے جس آدمی کو سنتریوں کی توجہ ہٹانے پر مامور کیا تھا وہ سمجھ جائے کہ اب ہم لوگ نکل رہے ہیں۔ چنانچہ اس آدمی نے سنتریوں سے باتیں شروع کر دیں۔

پہلے رابن رستی پکڑ کر کودا، اس کے بعد میں۔ دیوار بالکل صاف اور سیدھی تھی۔ ہم لوگ تھپکی کی طرح رستی کے سہارے دیوار پر چپکے چپکے آگے بڑھ رہے تھے۔ اتفاقاً سڑک پر کچھ راہ گیر بھی آنکلیے جن کی سگڑوں کا ڈھواں ہماری ناک تک پہنچا لیکن ہم انہیں نہ دکھائی دیے۔ خدا خدا کر کے برابر والی چھت پر ہم دونوں کود گئے اور چھتوں چھتوں آگے بڑھنے لگے۔ اس دوران بعض چھتیں ایسی بھی ملیں جن پر دیوار ہی نہ تھی اس لیے ایسی چھتوں پر سے گزرتے وقت ہم کو پیٹ کے بل گھسنا پڑا۔ یہاں تک کہ وہ چھت مل گئی جہاں رستی کی مدد سے نیچے اتر سکتے تھے۔ اترنے کے لیے سامنے جو نظر ڈالی تو کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے کی کھڑکی پر ٹر برگید کا ایک افسر بیٹھا ہماری طرف دیکھ رہا ہے۔ اس پر نظر پڑتے ہی ہم بدحواس ہو گئے۔ کچھ دیر کے لیے ہم لوگ وہیں بیٹھ گئے اور اس افسر کی حرکات کو بغور دیکھتے رہے مگر وہ بس سے مس نہ ہوا تو ہمیں یقین ہو گیا کہ وہ ہمیں دیکھ نہیں سکا۔ بہر حال ہم لوگ اسی چھت پر ایک گھنٹے تک بیٹھے رہے۔

نہ کی جائے۔ چنانچہ میں نے اپنے دوسرے ساتھیوں سے مشورہ کیا، بالخصوص رابن پال سے بناوڑ خیال کیا۔ لیکن طے یہ پایا کہ ابھی ایسا ارادہ بڑا خطرناک ہو گا۔ کیونکہ راستے میں جو علاقہ پڑتا ہے وہاں دشمن کی افواج کے علاوہ غنڈے بد معاش بھی پھرا کرتے ہیں اور ساحل سمندر پہنچ کر کسی یونانی جزیرے تک پہنچنا بھی خطرے سے خالی نہیں۔ چنانچہ منصوبہ یہ بنایا گیا کہ پہلے کسی نہ کسی طرح قسطنطنیہ پہنچا جائے۔ قسطنطنیہ جانے کی ترکیب یہ سوچی گئی کہ ہم دونوں بیمار بن گئے۔ جسم پر کئی جگہ اپنے ہاتھ سے زخم ڈال دیے اور ڈاکٹر کو رشوت دے کر حیدرآباد اسپتال بھیجے جانے کی سفارش لکھوالی۔ اس طرح قسطنطنیہ پہنچ گئے۔ یہاں ایک عیسائی مل گیا جس کا مکان مضائقہ میں تھا۔ اس نے ہماری مدد کی۔

ہم جس کمرے میں بند تھے اس میں ایک کھڑکی تھی۔ کھڑکی کے نیچے دو کڑے لگے تھے۔ طے یہ پایا کہ ایک کڑے پر پیر رکھ کر اور دوسرے کو پکڑ کر برابر والے مکان کی چھت پر کود جائیں گے، وہاں سے چھتوں چھتوں بہت دور نکل جائیں گے۔ پھر جس مکان کی دیوار پر سے اترنا آسان ہو گا وہیں اتر جائیں گے۔ کیونکہ ہمیں یہ یقین تھا کہ لوگ عام طور پر اس جگہ نہیں دیکھتے جہاں انہیں یقین نہ ہو۔ اس سلسلے میں ہمیں جو تیاریاں کرنی پڑیں وہ آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ شہر کے نقشے کی فراہمی، رسیوں کا حصول دیگر ساتھیوں کو تیار کرنا اور بعض دوسرے کام، بڑے بڑے اہم مرحلے درپیش تھے۔ آخر خدا خدا کر کے وہ رات آپہنچی جس میں ہمیں یہاں سے نکلنا تھا۔

اپنے ساتھ مکان کی دوسری منزل پر لے جا کر ایک نہایت گندے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ ہم تھکے ہوئے تو تھے ہی۔ لمبی تان کر سو گئے اور اس وقت تک سوتے رہے جب تک کہ جڑواں بھائیوں نے ہمیں آکر نہ جگایا۔

ہم نے سارا دن اسی مکان میں کاٹا۔ سہ پہر کے وقت ہم بیڈروم میں بیٹھ کر آگے چلنے کا پروگرام بنانے لگے قسطنطنیہ کے وہاں سے کئی راستے تھے ہم نے مختلف راستے پسند کیے۔ رابن پال نے طے کیا کہ خشکی کے راستے قسمت آزمائی کی جائے۔ چنانچہ اس نے ایک عرب بھکاری کا بھیس بدل لا اور ڈھیلے ڈھالے کپڑے ٹھاکر نکل کھڑا ہوا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ کیجنت کہیں نہ کہیں پکڑا منور جائے گا لیکن اس نے بڑی ذہانت کا مظاہرہ کیا، ایک ہاتھ میں وہی کاپیالا پکڑا، دوسرے ہاتھ میں سلادہ تاکہ دیکھنے والے یہ سمجھیں کہ کوئی شریف آدمی کھانا کھانے کے لیے مناسب جگہ کی تلاش میں ہے۔

میرا منصوبہ رابن کے مقابلے میں زیادہ آرام کا تھا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ روسی شہزادے کے غلام کی حیثیت سے قسطنطنیہ سے نکل کر بغداد پہنچ لیا جائے، لیکن قسمت نے باوری ہی نہ کی۔ رابن مالگرہ پہنچتے ہی گرفتار کر لیا گیا اور میرا شہزادہ چلا ہی نہیں۔ اب میں نے سنگری کے میکانک کاروپ دھار لیا۔ پٹھر پرانے کپڑے پہنے چشمہ لگایا اور رنگی ہوئی مونچھیں لگا کر اپنا عملیہ بدل لیا۔ پھر ایک جعلی پاسپورٹ کا

جب وہ افسر کھڑکی سے ہٹ گیا تو ہم رستی کے ذریعے شرب پراتر گئے۔ اترتے وقت میرے قدم ایک دکان کے سائن بورڈ سے ٹکرا گئے لیکن یہ آواز کچھ نقصان نہ پہنچا سکی۔ اب ہم دشمن کے علاقے میں ہوتے ہوئے بھی آزاد تھے۔ البتہ یہ مسئلہ جوں کا توں باقی تھا کہ وہاں سے نکل کر کدھر جائیں؟ ابھی ہم اس خیال میں غلطاں و بیچاں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے کہ مسجد فاتح کے پاس ایک گھوڑا گاڑی کی گھر گھڑا ہٹ نے ہیں چونکا دیا۔ ہم پک کر ایک قریبی کھنڈر میں گھس گئے اور سیدھے سیدھے لیٹ گئے۔ چند لمحوں بعد وہ گاڑی سامنے سے گزری۔ خدا کا شکر ہے اس میں کوئی مسافر نہ تھا صرف کو جوان شراب کے نشے میں دھت گاڑی اڑانے چلا جا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی رات کی تاریکی میں گم ہو گئی۔ ہم دونوں فاتحانہ شان سے باہر نکلے اور استنبول کی راہ پر پڑے۔

کوئی چار بجے صبح ہم اس مکان پر پہنچ گئے جہاں قیام کے لیے پہلے سے انتظام کر لیا گیا تھا۔ دروازے پر دستک دی تو ایک بچہ باہر آیا میں نے اس سے کہا: ”کیا ہم لوگ اندر آ سکتے ہیں؟“

”کیا آپ لوگ مفروضہ قیدی ہیں، آپ کو تو دو گھنٹے پہلے پہنچنا چاہیئے تھا۔“

”صبح کا بھولا اگر شام کو واپس آجائے تو اس کو بھولا نہیں کہتے۔“ رابن نے کہا۔ مکان کا دروازہ کھل گیا۔ ایک یونانی ویر تھم سائل، اس کی ماں، چچی، مادی اور دو جڑواں بچوں نے ہمارا خیر مقدم کیا اور یہیں

انتظام کیا۔ موٹر بوٹ کو پیشگی کرایہ دیا تاکہ وہ مجھے عدلیہ تک پہنچا دے میں اپنے مینز بانوں سے بہت خوش تھا اور ان کو ایک سو پونڈ بطور انعام دینے ہی والا تھا کہ خطرے کی گھنٹی بجی۔ تھوڑی دیر میں مجھے بتایا گیا کچھ عام سپاہی اور کچھ خفیہ والے عمارت میں داخل ہو چکے ہیں۔ میں نے چاہا کہ کمرے کی کنڈی اندر سے لگا کر چپکا بیٹھ رہوں لیکن چند لمحوں کے اندر ہی تھیمسٹائل دو سپاہیوں سمیت سامنے آکھڑا ہوا۔ ایسا معلوم ہوا رہا تھا جیسے کہ وہ کسی سے لڑ کر آ رہا ہو کیونکہ اس کا چشمہ ٹوٹ چکا تھا، ناک سے خون بہہ رہا تھا اور کالر پھٹ کر چھٹھڑے چھٹھڑے ہو چکا تھا۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا اور کہتا جا رہا تھا کہ اس نے مجھ کو کبھی پہلے نہیں دیکھا لیکن کوئی اس کی بات پر یقین نہیں کر رہا تھا۔ اس طرح میری پانچ ہفتوں کی جدوجہد کا انجام اس مختصر سے قافلے کی شکل میں نمودار ہوا جس میں دو دہشت زدہ بچے، آہ وزاری کرتی ہوئی ماں، پریشان حال یونانی اور کچھ دوسرے افراد شامل تھے اور جن کی منزل سنٹرل جیل تھی۔ اس کے بعد ہم برچو کچھ بیتی اور جس طرح ہم نے آزادی حاصل کی۔ وہ ایک طویل داستان ہے اور جو قریب قریب ناممکن واقعات کا تسلسل ہے۔ گرفتاری کے بعد مجھے ایک کالی کوٹھڑی میں رکھا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد قید یا مشقت کو قید تنہائی میں بدل دیا گیا۔ وہاں میری دوستی سلطان نرکی کے بھتیجے سے ہو گئی۔ جسے اپنے استاد کے پیٹھ لگالے کے جرم میں ایک ماہ کی قید ہو گئی تھی۔ اس کی مدد سے رابن اور میں جنگ بندی سے ایک ہفتہ قبل جنرل سیٹھ رز کی مرسیڈیز میں بیٹھ کر دوبارہ فرار ہو گئے۔

## سمندر میں گھیراؤ

پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں نے ایک عجیب و غریب بحری جہاز استعمال کیا تھا۔ یہ جہاز بظاہر تو تجارتی معلوم ہوتا تھا لیکن درحقیقت نہایت خطرناک قسم کا جنگی جہاز تھا اور کیوشپ کے نام سے مشہور تھا اس کا کام یہ تھا کہ اُسے تجارتی جہاز سمجھ کر دشمن اپنی آبدوزوں کو اوپر لے آئے اور جوہنی وہ اوپر آئیں اُن پر گولہ باری شروع کر دی جائے۔ جزائر برطانیہ کے چاروں طرف ان کیو جہازوں کا جال بچھا دیا گیا تھا۔ میں انھی میں سے ایک جہاز کا کپتان تھا۔

یہ ایک بڑی زبردست مہم تھی اور انتہائی مستعدی اور حاضہ دماغی کی متقاضی تھی۔ فوج کا ہر وقت چوکنا رہنا، اسلحہ کی کارکردگی، مختلف "e" جہازوں کے درمیان باہمی رابطہ، دنیا بھر کی ٹیلیگرافی کی فراہمی اور ان کے مطابق منصوبہ بندی اور فوری عمل، غرض ہر مرحلہ زبردست جوش مندی اور حوصلہ چاہتا تھا۔ ذیل میں ایک جرمن آبدوز کے گھیراؤ کا ذکر کیا جا رہا ہے جس کی کامیابی سے نہ صرف میرے وطن کا نام روشن ہوا بلکہ مجھے

لیفٹیننٹ کمانڈر کے عہدہ سے ترقی دے کر وائس ایڈمرل بنا دیا گیا۔  
میرا جہاز جیسے ہی ساحل سمندر سے روانہ ہوا، یہ خبریں آنا شروع  
ہو گئیں کہ دشمن کی آبدوزیں جنوبی مشرقی آئر لینڈ کے آس پاس موجود  
ہیں اور برابر آگے بڑھ رہی ہیں۔ ہم اس اطلاع کے اس قدر جلد ملنے  
کی توقع نہیں کر رہے تھے۔ بہر کیف جو اطلاع بھی آتی اُسے ہم نوٹس  
بورڈ پر لگوا دیتے تاکہ پورے عملہ تک خبر پہنچ جائے۔ اس خبر کے پھیلنے  
ہی لوگوں میں ایک جوش و خروش پھیل گیا اور وہ اپنی اپنی تیاریوں میں  
لگ گئے۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے سوالات پیدا ہو رہے تھے۔  
آبدوز کدھر سے حملہ آور ہوگی، مقابلے کے وقت کیا حالات ہوں گے؟  
غرض اُمید و بیم کی کیفیت میں آگے بڑھتے رہے۔ ہمارے جہاز پر غیر  
جانبدار ملک کا پرچم لگا ہوا تھا۔

رات کے کوئی دس بجے ہوں گے کہ ہمیں ایک جہاز مخالف سمت  
میں جاتا نظر آیا۔ خوب غور سے دیکھنے پر یقین ہو گیا کہ ضرور کوئی آبدوز ہے۔  
چنانچہ ہم نے پورے حوصلے کے ساتھ اس پر حملہ کی تیاری کر لی۔ اس وقت  
چونکہ مکمل تاریکی تھی اور گولہ باری کرنے میں نشانہ خطا ہو جانے کا امکان  
اس لیے نزدیک پہنچ کر حملہ کرنا زیادہ مناسب سمجھا گیا اور ہم نے نزدیک  
جانا شروع کر دیا مگر تحقیق پر معلوم ہوا کہ یہ آبدوز کشتی نہیں ہے بلکہ پہرہ  
دینے والی کشتی فوج کی کشتی ہے۔ چنانچہ مطمئن ہو کر ہم نے اپنی راہ لی۔  
لیکن دل میں یہ شک قائم رہا کہ کہیں دوسری کشتی والے ہم پر حملہ نہ کریں

یہ سوچتے ہی میرے جسم میں ایک جھنجھری سی دھڑکنی اور ہر لحظہ گویوں کی  
بوچھاڑ کا یقین ہونے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ جہاز نزدیک آ گیا اور  
اس نے سگنل کے ذریعے دریافت کیا کیسا جہاز ہے۔ ہم نے  
اپنا فرضی نام بتا دیا۔ یہ نام ایک ایسے لفظ سے ملتا جلتا تھا جسے عام  
طور پر ملاح بولا کرتے ہیں۔ دشمن کے جہاز نے میری بات کو مذاق  
سمجھا اور اپنی ٹوہن پر محمول کیا۔ نتیجتاً ہمارا تعاقب شروع کر دیا۔ جتنی  
مرتبہ وہ ہمارے بارے میں پوچھتا ہم اپنا پہلا ہی جواب دوہرا دیتے  
اور اس کا رد یہ سخت تر ہو جاتا۔ اچانک مجھے وائرلیس کے ذریعے اطلاع  
ملی کہ یہ جہاز اپنا ہی ہے اور پیٹرول ڈیلوئی پرنکلا ہے۔ یہ اطلاع دوسرے  
جہاز کو مخصوص الفاظ میں پہنچائی تب کہیں جا کے اس سے گلو خلاصی  
ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ جوش و خروش اچانک سرد پڑ گیا جو  
اس جہاز کو دیکھتے ہی پیدا ہوا تھا اور میں یہ سوچنے لگا کہ دیکھو  
اب دوسرا موقع کب ملتا آتا ہے۔

ایک موقع پر تو بڑا لطف آیا۔ مجھے اچانک خبر ملی کہ دو آبدوزیں  
میرے جہاز سے کچھ ہی دور موجود ہیں اور باہمی گفتگو میں مصروف ہیں۔  
میں نے سوچا کہ کیوں نہ انھیں قریب لانے کے لیے کوئی کارروائی  
کی جائے چنانچہ میں نے وائرلیس کے ذریعے مصنوعی سگنل اپنے  
ہیڈ کوارٹر کو دینا شروع کر دیے اور کوشش کی کہ سگنل ان آبدوزوں  
تک بھی پہنچ جائیں۔ مثلاً سگنل کے ذریعے یہ کہا ہو..... اچی.....



جی ہاں.....! موسم کی وجہ سے دیر ہو رہی ہے..... اس وقت فلاں فلاں عرض البلد اور طول البلد پر موجود ہوں..... جمعہ کے دن ۶ بجے یورپول پہنچ رہا ہوں..... وغیرہ وغیرہ۔" کچھ توقف کے بعد آواز بدل کر دوبارہ پیغام دیا "آپ کی اطلاع مل گئی۔" یہ تمام سگنل صرف آبدوزوں کو اکسلنے اور اپنے قریب بلانے کے لیے تھے لیکن وہ ہمارے جہاز کے نزدیک نہ آئیں۔ غالباً ہماری واٹر لیس اطلاع اُن تک نہ پہنچ سکی۔ ہو سکتا ہے اُن کی لہروں کی لمبائی کچھ مختلف ہو۔ غرض ہماری بد قسمتی کہ یہ موقع بھی ہاتھ سے نکل گیا اور دل کی تناؤ دل ہی میں رہ گئی کہ ایک آبدوز کو تو ٹھکانے لگا دیتے۔

سمندر میں ہمارا سفر ہفتوں تک جاری رہا۔ ہم نے اپنے جہاز کو ہر اعتبار سے غیر جانبدار رکھا اس غیر جانبداری کو ثابت کرنے کے لیے اس کی معمولی چیزوں اور علامتوں کو بھی بدل دیا گیا تھا کیونکہ حلیہ بدلنے کے لیے معمولی معمولی جزئیات کو بھی تبدیل کرنا پڑتا ہے۔ غیر جانبداری میں کچھ خطرات بھی ہیں۔ مثلاً آبدوز کشتی محض راستہ معلوم کرنے کے لیے غیر جانبدار جہاز کے پیچھے پیچھے چل سکتی ہے اور جب اُسے یہ پتا لگ جائے کہ یہ جہاز غیر جانبدار نہیں ہے تو وہ اطمینان سے حملہ کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ آبدوز خود کو روپوش رکھنے کے لیے کسی غیر جانبدار جہاز کا سہارا لے کر چلتی رہے۔ بہر حال میرے جہاز پر غیر جانبداری کا نشان ہونے کے باوجود

کوئی آبدوز قریب نہ پھینکی۔

اس طرح کئی ہفتے گزر گئے۔ ایک روز یہ اطلاع ملی کہ مغربی ساحل سے پانچ میل دور ایک آبدوز کشتی کی موجودگی کا ثبوت مل چکا ہے۔ یہ واقعہ ۲۲ مارچ ۱۹۱۶ء کا ہے۔ صبح ۶ بج کر چالیس منٹ پر جب رات کی سیاہی ختم ہو رہی تھی اور مشرق میں سپیدی نمودار ہو چکی تھی، میں نے ایک بلند مقام سے دورین کے ذریعے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ اطلاع واقعی صحیح تھی۔ کوئی چیز جس پر مجھیروں کی کشتی کا گمان بھی کیا جاسکتا، صاف نظر آرہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی وہ چیز غائب ہو گئی جس سے مجھے یقین ہو گیا کہ یہ آبدوز ہے جو بانی کے اندر چلی گئی۔ بس پھر کیا تھا دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ جہاز کا عملہ مشین کی سی پھرتی سے اپنے اپنے کام میں لگ گیا۔ کیونکہ سب کی آزمائش کی گھڑی آن پہنچی تھی۔ مجھے اس بات کی فکر تھی کہ آبدوز نے پہلے ہمارے جہاز کو دیکھ لیا ہے جس کی چھینوں سے دھواں نکل رہا تھا۔ پھر جہاز بے بھی بہت بڑا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ہمارے جہاز ہی کو ڈبو دے یا کوئی ایسا دھماکہ ہو کہ ہم سب ہوا میں اڑتے نظر آئیں اور جواب میں ایک گولی بھی نہ چلا سکیں مگر اس خوف کے باوجود میں نے جہاز کو آگے بڑھنے کا حکم دے دیا۔ بندوچی اپنی اپنی جگہ تیار بیٹھے تھے اور دشمن کے اگلے قدم کا انتظار کر رہے تھے۔ اس عالم میں بس منٹ گزر گئے۔ ٹھیک سات بجے ہمیں تارپیڈو کے گزرنے کا احساس ہوا اور ہم نے مقابلے کی ٹھان لی۔ یہ ہماری خوش قسمتی

تھی کہ تارپٹہ و جہاز کے قریب سے ہو کر گزر گیا اور ہم لوگ بال بال بچ گئے اور آبدوز نے بندوق سے فائرنگ بھی نہیں کی ورنہ ہماری شامت یقیناً آجاتی۔ وہ لوگ شاید موسم کی خرابی کی وجہ سے فائرنگ سے باز رہے تھے۔ تاہم خطرہ ہر لمحے بڑھتا جا رہا تھا۔ ممکن تھا کہ دوسرا تارپٹہ و کام کر جاتا جو کسی وقت بھی متوقع تھا۔

لیکن ابھی چند ہی لمحے ہوئے ہوں گے کہ اچانک بندوق کی آواز سنائی دی۔ اب آبدوز سامنے آچکی تھی جس کی بندوق سے فائر کیا گیا تھا۔ یہ فائر اصل سگنل کے طور پر کیا گیا تھا تاکہ ہمارا جہاز رک جائے۔ گولی چلانے کے فوراً بعد آبدوز جزوی طور پر پانی میں چلی گئی تاکہ اگر اس پر حملہ ہو تو وہ غوطہ لگا کر دوسری طرف نکل جائے۔ ہم لوگ بھلا کہاں چوکنے والے تھے ہم نے فوراً اپنے طے شدہ پروگرام پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ جونی گولی کی آواز ہوئی، انجن کو روک دیا گیا۔ پوری شدت کے ساتھ بھاپ چھوڑی گئی اور کسی مصیبت زدہ جماعت کی حالت کا مظاہرہ کیا جانے لگا۔ آبدوز کو یہ سب دیکھ کر اطمینان ہو گیا کہ جہاز صحیح ہے اور کسی سے ملنے بچنے جا رہا ہے۔ اس کے بعد پہلے تو وہ سطح سمندر پر آئی پھر ہمارے جہاز کے قریب آ پہنچی۔ پورا اطمینان ہو جانے پر وہ آگے بڑھ گئی۔ اب آبدوز ہمارے قریب سے بچتی بچاتی کوئی آٹھ سو گز پر پہنچ چکی تھی۔ یہ فاصلہ ہمارے جہازوں کی بندوقوں کی رینج کے برابر ہے۔ اب وقت آ بیٹھا تھا کہ ہماری طرف سے فائرنگ شروع ہو جاتی۔ میں نے عین موقع پر سیٹی بجائی۔

میشی بجتے ہی سب سے اونچے مستول پر برطانوی بحریہ کا علم لہرانے لگا اور وہ تمام نشانات جو غیر جانب داری کی علامت کے بطور کھینچے ہوئے تھے نیچے آ رہے چند لمحوں کے اندر بارہ پونڈ کے گولے والی توپوں کے دہانے کھل گئے اور رائفلوں سے بھی گولیوں کی بارش شروع ہو گئی۔ یہ حملہ اس قدر شدید تھا کہ آبدوز کا مکمل گھیراؤ ہو گیا۔ ہمارے پاس چونکہ ایسا کوئی انتظام نہ تھا کہ صحیح صحیح فاصلہ معلوم ہو جاتا اس لیے محض اندازے سے گولیاں چلائی جاتی رہیں لیکن آبدوز بہت چھوٹی تھی اس لیے اس پر کوئی تباہ کن نشانہ نہ بیٹھ رہا تھا۔ آخر کافی گولہ بارود ضائع کرنے کے بعد ایک نشانہ ٹھیک بیٹھ گیا، آبدوز تباہ ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے پانی میں غائب ہونا شروع ہو گئی۔ اب ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ آبدوز مکمل طور پر تباہ ہو گئی ہے۔ پھر بھی ہم احتیاطاً پانی میں پھٹنے والے بم پھینک کر مارتے رہے۔ اتنے میں آبدوز اچھل کر اوپر آگئی اور ہمارے جہاز کے تیلے سے لگتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ جب وہ جہاز سے کچھ فاصلے پر پہنچی تو صاف نظر آ رہا تھا کہ اس کا پیرسکوپ اڑ چکا ہے اور اگلے حصے میں شگاف پڑ گئے ہیں۔ اس کے باوجود ہمارے بندو بھ میں متکون نہیں ہوئے اور معمولی سے امکان کو بھی ختم کرنے کے لیے انھوں نے دو تین فائر مزید کر دیے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ کئی بم پھینک مارے۔ یہاں تک کہ سمندر کی سطح پر دو در دو تیل اور لکڑی کے ٹکڑے پھیل گئے اور کوئی آدمی زندہ نہ بچ سکا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ یہ آبدوز یو۔ ۶۸ تھی جو اپنا کام کرنے سے پہلے

تھی کہ تارپٹہ و جہاز کے قریب سے ہو کر گزر گیا اور ہم لوگ بال بال بچ گئے اور آبدوز نے بندوق سے فائرنگ بھی نہیں کی ورنہ ہماری شامت یقیناً آجاتی۔ وہ لوگ شاید موسم کی خرابی کی وجہ سے فائرنگ سے باز رہے تھے۔ تاہم خطرہ ہر لمحے بڑھتا جا رہا تھا۔ ممکن تھا کہ دوسرا تارپٹہ و کام کر جاتا جو کسی وقت بھی متوقع تھا۔

لیکن ابھی چند ہی لمحے ہوئے ہوں گے کہ اچانک بندوق کی آواز سنائی دی۔ اب آبدوز سامنے آچکی تھی جس کی بندوق سے فائر کیا گیا تھا۔ یہ فائر اصل سگنل کے طور پر کیا گیا تھا تاکہ ہمارا جہاز رک جائے۔ گولی چلانے کے فوراً بعد آبدوز جزوی طور پر پانی میں چلی گئی تاکہ اگر اس پر حملہ ہو تو وہ غوطہ لگا کر دوسری طرف نکل جائے۔ ہم لوگ بھلا کہاں چوکنے والے تھے ہم نے فوراً اپنے طے شدہ پروگرام پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ جونی گولی کی آواز ہوئی، انجن کو روک دیا گیا۔ پوری شدت کے ساتھ بھاپ چھوڑی گئی اور کسی مصیبت زدہ جماعت کی حالت کا مظاہرہ کیا جانے لگا۔ آبدوز کو یہ سب دیکھ کر اطمینان ہو گیا کہ جہاز صحیح ہے اور کسی سے ملنے بچنے جا رہا ہے۔ اس کے بعد پہلے تو وہ سطح سمندر پر آئی پھر ہمارے جہاز کے قریب آ پہنچی۔ پورا اطمینان ہو جانے پر وہ آگے بڑھ گئی۔ اب آبدوز ہمارے قریب سے بچتی بچاتی کوئی آٹھ سو گز پر پہنچ چکی تھی۔ یہ فاصلہ ہمارے جہازوں کی بندوقوں کی رینج کے برابر ہے۔ اب وقت آ بیٹھا تھا کہ ہماری طرف سے فائرنگ شروع ہو جاتی۔ میں نے عین موقع پر سیٹی بجائی۔

ہی تباہ کر دی گئی۔ اس پر تمام عملے میں مسرت و شادمانی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ لوگ بے پناہ جوش و خروش عقیدت کے ساتھ بارگاہِ ایزدی میں مسجود ہوئے لگے اور ہر طرف فتح کے نغمے بکھرنے لگے۔

ہم لوگوں کا خیال تھا کہ ہماری مہم جاری رہے گی اور اب دوسرے ہتھیار کی تلاش میں آگے بڑھیں گے۔ لیکن کمانڈر انچیف نے مبارکباد کے پیغام کے ساتھ ہی ہمیں واپسی کا حکم دے دیا اور ابھی ہم واپس بھی نہیں ہو پائے تھے کہ ایڈمرل خود ہمارے جہاز پر تشریف لے آئے۔ یہ اعزاز انھوں نے اس سے پہلے کبھی کسی کو نہیں دیا تھا۔ ایڈمرل نے سارے عملے کو اکٹھا کر کے ہمارے کارنامے پر حکومت کی طرف سے مبارکباد دی، انعامات و اعزازات سے نوازا اور مجھے ترقی دے کر وائس ایڈمرل بنا دیا۔

(وائس ایڈمرل گارڈن کمپبل)



**Rear Admiral  
Gordon  
Campbell-Born: 6  
January 1886  
-Died: 3 July 1953**

## ۴۔ موت کے دروازے تک!

اس داستان کے ہیرو ایک امریکی باشندے آر تھر گاٹی ایچے ہیں جنہوں نے جنگِ عظیم میں اتحادیوں کا ساتھ دینے کے لیے اپنی ملازمت چھوڑ دی اور یورپ آکر جنگ میں کود پڑے۔ یہ وہ وقت تھا، جس وقت تک امریکہ نے جنگ میں باضابطہ شرکت نہیں کی تھی۔ بہادر نوجوان مغربی محاذ پر اگلے مورچوں میں پہنچ گیا۔ موت کے دروازے تک پہنچ کر بھی اس کے حوصلے میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ اس نے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور اس حالت میں بھی دشمن کا مقابلہ کیا۔ اگر کسی وقت دنیا کی کشش، خاندان کی محبت اور زندہ رہنے کی ترپ نے اس کے پاؤں میں پٹریاں ڈالنے کی کوشش کی تو اس کا آہنی عزم اڑے آگیا۔ جب بھی اُسے آگے بڑھنے کا حکم ملتا تو اس کے پھرے پر ایک سُرخی دوڑنے لگتی۔

ایک دن وہ اسی سوچ میں بیٹھا تھا کہ کئی روز سے اُسے کسی نئے آپریشن کا حکم نہیں ملا کہ اتنے میں بڑے افسر کے آنے کی اطلاع ملی اور اس خبر

گزر رہے تھے اور جرمن مورچوں کو محسوس کرتے جا رہے تھے۔ زمین کانپ رہی تھی۔ لوگوں کے چہنچہنے چلانے اور کراہنے کی بھیانک آوازیں کانوں پر بوجھ بن رہی تھیں۔ جرمن سپاہی بھی مشین گنوں سے جوابی گولہ باری کر رہے تھے، لیکن اتحادیوں کے زبردست حملے کے سامنے اُن کی حیثیت محض ٹپاخوں کی سی تھی۔ آخر اٹھارہ اٹھارہ پونڈ کے گولوں نے جرمن دفاعی لائن کو بالکل تباہ کر کے رکھ دیا جبکہ ادھر کا نقصان بہت معمولی سا تھا۔ ہر حال سب کو یہی خوف تھا کہ ہم بجے حملہ ختم ہو جائے گا یعنی دشمن کی گولہ باری جاری رہے گی اور موت انھیں آدبوچے گی۔ اس خیال کے آتے ہی سارا بدن کانپ جاتا۔ ہم بچنے میں کوئی دس منٹ باقی ہوں گے کہ اعلان ہوا کہ دس منٹ باقی ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ دس منٹ گولے باری کے باقی ہیں لیکن اُس نے اس کا یہ مطلب لیا کہ اس کی زندگی کے صرف دس منٹ باقی ہیں۔ اور پھر اُسے ایسا لگا جیسے اس کے پاؤں سو گئے ہوں۔ پھر آواز آئی:-

پہلی صف کے سپاہی سیڑھیوں کے پاس جائیں۔  
یہ دراصل بانس کی سیڑھیاں تھیں جنہیں رکاوٹ کے ساتھ لگا دیا گیا تھا اور اب یہ حکم تھا کہ وہ ان سیڑھیوں پر چڑھ کر سب سے اونچی جگہ جا پہنچیں اور دوسری طرف کود کر پیش قدمی کریں۔ سپاہیوں نے اس کا نام موت کی سیڑھی رکھ چھوڑا تھا اور انھیں بھی وہ واقعی موت کی سیڑھیاں۔!

سے اُسے بڑی خوشی ہوئی کیونکہ اس کو یقین تھا کہ اس آمد میں کسی نئے حملے کی خوش خبری ہوگی۔ اُس کا اندازہ صحیح نکلا۔ افسر نے واقعی اُسے اسی قسم کی ہدایات دیں۔ پروگرام یہ تھا کہ اس کی ایک جماعت ۱۱ بجے کانٹے دار تاروں کی رکاوٹوں کو کاٹنے جائے گی۔ ۲ سے ۴ بجے تک پیدل فوج کے دستے مسلسل گولہ باری کریں گے اور دشمن کا حلقہ توڑ کر آگے بڑھ جائیں گے۔ اس ہدایت کے ملتے ہی اس کے دستے میں بڑی گہما گہمی شروع ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ اس آئے سامنے کے مقابلے میں خطرات زیادہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ لوگوں نے فوراً ہی اپنے گھروں کو خط لکھ دیے کہ وہ سب ہلاک ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنی اپنی وصیتیں بھی لکھ دیں۔ یہ خطوط کیپٹن کے پاس رکھوا دیے گئے تاکہ اگر وہ واقعی قتل ہو جائیں تو یہ خطوط ڈاک کی نذر کر دیے جائیں۔

وہ بار بار اپنی گھڑی کی طرف دیکھتا تھا اور ۲ بجے کا انتظار کر رہا تھا۔ دو بجنے میں پانچ منٹ کم پر اُس کے اعصاب جواب دینے لگے وہ ہر لمحہ یہی سوچ رہا تھا کہ عنقریب وہ بھی فائرنگ شروع کر دے گا۔ ٹھل پر اس کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی تھی۔ سامنے وہ دیوار تھی جو دشمن کی گولیوں سے محفوظ رہنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ جو نہی گھڑی کی سوئی ۲ پر پہنچی، گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ ایک عجیب قیامت کا سا منظر تھا۔ آسمان پر شعلوں کی سُرخ پھیلی ہوئی تھی۔ گولیوں کی ٹہیب آوازوں سے پورا جنگل گونج رہا تھا۔ گولے سروں کے اوپر سے

سب سپاہی سیڑھی کے نزدیک کھڑے ہو گئے اور حکم کا انتظار کرنے لگے۔ ایک امریکی سپاہی کی حالت خراب تھی۔ وہ جو اس باختمہ ایک طرف کھڑا لمبی لمبی سانس لے رہا تھا۔ اچانک آواز بلند ہوئی تین منٹ باقی ہیں۔ ہوشیار! تین منٹ بعد گولہ باری بند ہو جائے گی۔ اور سب اوپر چڑھنا شروع کر دیں گے۔ اور پھر یہ جملہ بھی کانوں سے سنے کر لیا۔ خدا تمھارا حامی و ناصر ہے۔ جہنم کو سدھارو۔

یہ ضرب المثل اتحادی فوجوں میں عام تھی وہ اس کا مطلب یہ لیتے تھے کہ سپاہی واپس تو آئے گا لیکن ٹولا، لنگڑا۔ اور اپنا بیج کی زندگی جہنم سے کم نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے گورے دعائیہ کلمہ خدا حافظ سے بہت چڑتے تھے۔

امریکی سپاہی نے کلائی کی گھڑی کی طرف دیکھا۔ چار بجے ہیں ایک منٹ باقی تھا۔ اس کی نظر گھڑی پر بیٹک گئی اور اسے ایسا لگا جیسے کہ دل کی دھڑکن رکنے والی ہو۔ ہر ایک طرف ایک موت کا سا ساٹھا چھا گیا۔ جیسے ہی منٹ کی سوتی بارہ پر پہنچی، تیز تیز سیٹیاں بجنے لگیں اور سپاہیوں نے سیڑھی پر چڑھنا شروع کر دیا۔ گولیاں سروں پر سے گزرتی رہیں اور یہ جاننا زور پر چڑھ چڑھ کر نیچے کودتے رہے۔ اب ان کو آگے ہی بڑھنا تھا۔

امریکی سپاہی کو دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہ تھی۔ وہ بس دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد کانٹے دار تار کا جھکڑ لگ گیا جس کے بیچ میں جکڑ

راستے بنے تھے۔ اس کے بعد وہ علاقہ شروع ہوتا تھا جو غیر جانبدار تھا، یعنی اس پر نہ اتحادیوں کا قبضہ تھا اور نہ جرمنی کا۔ تار کے جھکے کے قریب کوئی پندرہ ٹیٹ کے فاصلے پر ایک گورے نے اس کی طرف دیکھا اور اپنا ہاتھ منہ تک لے گیا۔ غالباً کوئی چیز کھالی لیکن گھبراہٹ میں امریکی سپاہی نہ دیکھ سکا کہ اس نے کیا کھایا۔ اس کے ساتھ ہی گورے کو ایک تے ہوئی اور وہ چکر کھا کر نیچے گر پڑا۔ چند لمحوں میں وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔ امریکی سپاہی کو بھاگتے میں ایسا لگا۔ جیسے گورا پانی کی سطح پر پیچھے کی طرف یہہ گیا۔

چاروں طرف سے دھماکوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ رائفل کی گولیوں کی بوچھاڑ میں سارے سپاہی آگے بڑھ رہے تھے۔ کہیں کہیں زمین سے دھول کے طوفان بھی اٹھتے نظر آرہے تھے جس کی وجہ سے آگے بڑھنا اور بھی خطرناک ہو جاتا تھا۔ خدا خدا کر کے غیر جانبدار علاقہ طے ہوا۔ جس سپاہی کے گولی لگ جاتی وہ وہیں ڈبیر ہو جاتا۔ بعض زخمی حالت میں بھی آگے بڑھتے رہے۔ ایک مقام پر چار فٹ پوڑی کھائی مل گئی۔ امریکی سپاہی تو کوڈ کر پار ہو گیا لیکن اس کے برابر والا چوک گیا اور نہایت گہری کھائی میں جا گرا۔ امریکی سپاہی کوڈنے کو تو کوڈ گیا لیکن دوسری طرف پہنچ کر اس کا دماغ ٹھکانے آ گیا۔ کیا دیکھنا ہے کہ ایک دیو پیکر شخص عین سامنے کھڑا ہے جس کے ہاتھ میں دس فیٹ لمبی رائفل ہے اور رائفل میں سات سنگینیں لگی ہوئی ہیں۔ وہ ہوا میں رائفل کو لہرا رہا تھا۔ امریکی سپاہی کے



کے سر پر اس زور کا گڈا لگا کہ اس کا سر پھٹ گیا۔ آن کی آن میں وہ زمین پر آ رہا اور اس کے سر سے خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ اسی اثنا میں دوسرا گورا نوجوان کے پیچھے چلا گیا اور اُس نے چشم زدن میں اس کی گردن میں سنگین آمار دی۔ وہ زخم کی تاب نہ لا سکا اور نیچے گر پڑا۔

امریکی سپاہی یہ تماشا دیکھنے میں ایسا کھویا کہ اُسے اپنے گرد و پیش کی کچھ خبر نہ رہی۔ اچانک اُسے محسوس ہوا کہ بائیں طرف کوئی چیز آ کر لگی ہے۔ گھوم کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک سنگین اس کے بھی گھونپی جا چکی ہے پھر وہ زمین پر چاروں شانے چیت گر گیا۔ ابھی اس کے ہوش و حواس قائم تھے اور چاروں طرف کی چیزیں نظر آرہی تھیں لیکن دوسرے ہی لمحے سر پر ایک زوردار چوٹ پڑی کہ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ پھر مکمل بے ہوشی!

اس کے بعد کا حال اُسے کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ البتہ جب ہوش آیا تو اُس نے خود کو ایک ہسپتال میں پایا۔ زخم جان لیوا ثابت نہ ہوئے اور چھ ہفتوں بعد اُسے ہسپتال سے رخصت مل گئی۔ اب وہ سرفروش تنظیم کارکن ہے۔ اور قومی خدمت میں پیش پیش ہے!

Arthur Guy Empry-Born: 11  
December 1883, Ogden,  
Utah-  
Died: 22 February 1963,  
Wadsworth, Kansas



ذہن میں معاً اپنے انٹرکٹر کے وہ الفاظ ابھرنے لگے جو اُس نے سنگین کے استعمال کے بارے میں بتائے تھے۔ اُس نے کہا تھا کہ جو نہی کسی دشمن سے منڈ بھڑ ہو فوراً اُس کے پیٹ میں سنگین پوسٹ کر دو۔ اس عمل میں اگر رائفل پر سے گرفت ڈھیلی ہونے لگے تو دشمن کو دھکا دے کر نیچے گرا دو اور پاؤں کے اشارے سے رائفل چلا دو۔ گولی اپنا کام دکھائے گی۔

امریکی سپاہی نے اس ہدایت پر پوری طرح عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن اُسے فوراً خیال آیا کہ انٹرکٹر نے یہ تو بتایا ہی نہیں تھا کہ دشمن کے نزدیک پہنچ کر سنگین کو کس طرح پیٹ میں اتارنا چاہیے۔ مارے دہشت کے اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور رائفل ہاتھوں سے چھوٹ گئی۔

چند لمحوں بعد جب اُس نے آنکھ کھولی تو وہاں نہ جرمن سپاہی تھا اور نہ اس کی دس فٹی رائفل۔ اور وہ اس شمش و پنچ میں مبتلا تھا کہ یہ خواب تھا یا حقیقت؟

اب پھر اُسے کوئی بیس فٹ کے فاصلے پر بائیں طرف ایک لمبا ترنگا نوجوان نظر آیا۔ اس کا قد بھی کوئی ساڑھے چھ فٹ سے کم نہ تھا مگر اس کی رائفل میں سنگین نہ در دھتی۔ وہ رائفل کی تالی کو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑے گندے کوہو میں لہرا رہا تھا۔ تین گورے اس سے نہرو آ رہے تھے۔ اس نوجوان کے سامنے وہ تینوں گورے بالکل بالشتیہ نظر آ رہے تھے۔ کچھ دیر تک وہ یہ تماشا دیکھتا رہا۔ کبھی کوئی گورا آگے آ جاتا اور دوسرا پیچھے چلا جاتا کبھی کوئی دوڑتا دڑ جاتا۔ اس لڑائی کے دوران ہی ایک گورے

تھی۔ آخر ہمارے ایک ساتھی نے جس کا نام علی بن الحسین تھا، مشورہ دیا کہ کوئی ٹرین اڑائی جائے۔ اُس نے کہا کہ کھانے کی کیا فکر تیس پونڈ جلی تو موجود ہے۔

علی کے اس مشورے پر سب لوگ ہماری طرف دیکھنے لگے جن کے چہروں سے پتا چل رہا تھا کہ وہ سب اس کام کے لیے تیار ہیں۔ میں نے اُن سے اتفاق نہیں کیا اور کہا: ٹرین اڑنا بھی ایک باقاعدہ فن ہے، یہ کوئی آسان کام تو نہیں ہے۔ اس میں کافی آدمیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ مشین گنوں کو صحیح پوزیشن میں نصب کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی غلطی ہو جائے تو خود اپنے لیے نقصان کا سبب ہو سکتا ہے۔ فی الوقت ایک مشکل یہ بھی ہے کہ ہندو فوجی سب ہندوستانی ہیں۔ وہ یوں تو بہت اچھے آدمی ہوتے ہیں لیکن سردی اور بھوک میں آدھے آدمی رہ جاتے ہیں۔ اگر عرب ہندو فوجی ہوتے تو کوئی مضائقہ نہیں تھا کیونکہ ان میں بھوک کی بڑاشت زیادہ ہوتی ہے، وہ کئی کئی دن خالی پیٹ لڑ سکتے ہیں اور اگر بغرض مال وہ بالکل ہی نڈھال ہونے لگیں تو سواری کے اونٹ ذبح کر کے کھا سکتے ہیں جبکہ ہندوستانی مسلمان تک اونٹ نہیں کھاتے حالانکہ اونٹ مذہباً حلال ہے۔ علی نے جواب دیا: آپ دنیا بھر کے مسائل مجھ پر چھوڑ دیجیے۔ میں عرب ساتھیوں کی مدد سے ٹرین کا ملبہ بغیر مشین گنوں کے اٹھواؤں گا۔ آپ تو صرف ٹرین اڑا دیجیے۔ علی کے اصرار پر میں راضی ہو گیا۔ اس پر بانی ساتھیوں کو بڑی خوشی ہوئی اور سب مل کر جلدی

## ۵۔ لارنس آف عربیا

بیسویں صدی میں دُنیا نے جتنے سپہ سالار دیکھے ہیں ان میں ایک سے ایک بہادر اور جگمگو تھا۔ لیکن ایسا سپہ سالار جس کی شخصیت افسانوی روپ اختیار کر گئی ہو، صرف ایک ہی ہے، جسے عرب کا لارنس کہا جاتا ہے۔ اہل عرب اُسے پیار سے ”الاورنس“ کہتے تھے۔ اُس نے پہلی جنگ عظیم میں عرب افواج کی کمان کی تھی اور ترکوں کا مقابلہ کیا تھا۔ اس کی تمام زندگی بہادری اور سرکردگی کے کارناموں سے بھرپور ہے۔ وہ آگسٹورڈ کا اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان تھا لیکن اس کی اولوالعزمی نے اُسے سپہ سالار بنا دیا۔ ٹرین تباہ کرنے کے فن میں اس کا کوئی ثنائی نہیں تھا۔ ذیل میں ٹرین اڑائے جانے کی ایک کہانی خود اُسی کی زبانی بیان کی جاتی ہے۔

شدید سردی کا موسم تھا۔ بوند باندی بھی رہ رہ کر ہو رہی تھی جس سے سردی کی لہر میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ ہم لوگ ایک مقام پر پھٹ کر آئیدہ کا پروگرام بنا رہے تھے۔ دو عرب قبائل بن صحر اور صراحیین کے کچھ لوگ ہمارے ساتھ تھے۔ راشن ختم ہو چکا تھا۔ چنانچہ سب سے بڑھ کر ہمیں راشن کی فکر

ہمارا ایک سہرا بارود میں دبا دیا، دوسرا سہرا پلپا کے نیچے سے نالے کی تہ میں لے گیا۔ اس تہ میں گول گول چکنے پتھر تھے۔ تار کو ان پتھروں میں پھپھاتے ہوئے اگلا سہرا آگے بڑھا دیا۔ تار کوئی ساٹھ گز لمبا تھا جو پوری ٹرین کو اڑانے کے لیے ناکافی تھا لیکن اس سے زائد تار کہاں سے آتا۔ چار ونا چار اتنے ہی پر فاعیت کی۔ شدید سردی اور نالے میں مٹی کچھڑ ہونے کی وجہ سے اس کام میں کافی وقت لگ گیا۔ پھر بھی اس سے فارغ ہو کر نہیں نے تمام علاقے کا بغور معائنہ کیا اور جہاں جہاں بارود اور تار پھیلا یا تھا اس پر خشک مٹی ڈال دی۔ گھاس پھوس سے گٹا پھٹا حصہ بھی ڈھک دیا تاکہ دشمن کو کوئی شبہ نہ ہو۔ اس میں کچھ اور وقت صرف ہو گیا۔ میں ابھی اپنا کام مکمل کر کے دوسرے ساتھیوں کے قریب بھی نہ پہنچ سکا تھا کہ دشمن کے گشتی دستے کی آہٹ ملی جو دیکھتے ہی دیکھتے آیا بھی اور گزر بھی گیا۔ اس کے بعد ہی پیچھے سے ایک ٹرین بھی آگئی۔ غالباً مال گاڑی تھی۔ چونکہ صبح کا وقت تھا اس لیے گھر بھی کافی پھیلا ہوا تھا اور بارش کی وجہ سے دور کی چیزیں نظر نہ آرہی تھیں۔ اس لیے ٹرین کی آمد کا پہلے سے اندازہ ہی نہ ہو سکا مگر خبر ملتی ہی میں نے حمود کو آواز دی کیونکہ دھماکے کا سامان اُسی کے پاس تھا لیکن وہ میرے پاس آ بھی نہ سکا تھا کہ ٹرین پوری رفتار سے گزر گئی اور ہم سب کھڑے دیکھتے رہ گئے علی کو تو اتنی مایوسی ہوئی کہ اُس نے کہنا شروع کر دیا کہ اس بار ہم لوگ کچھ نہیں کر سکتے پہلی بار جو کچھ ہوا تھا وہ محض ایک اتفاق تھا!

جلدی رات کے کھانے میں مصروف ہو گئے۔ دوسرے دن سب صبح تڑکے ہی اُٹھ بیٹھے۔ سب پہلے ہندوستانیوں اور معذور عربوں کو واپس بھیج دیا گیا، باقی ساٹھ افراد تمام تیاریوں سے نئیں ہو کر ریلوے لائن کی طرف چل پڑے۔ علاقہ ان سب کے لیے نیا تھا۔ اس لیے میں نے راہ نمائی کی اور سب ضیفر کے مقام پر جا پہنچے۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں موسم بہار میں ہم پہلے بھی تباہی مچا چکے تھے۔ یہاں ایک پہاڑ کی چوٹی پر ایک غار سا بنا تھا جو ہماری پناہ گاہ تھا کیونکہ محفوظ ہونے کے ساتھ ساتھ یہاں سے کافی دور تک کے علاقے دیکھے جاسکتے تھے۔ مغرب تک ہم سب یہیں بیٹھے سردی مناتے رہے، اس کے فوراً بعد سُرنگ بچانے کے لیے نیچے اُتر آئے۔ اس مقام پر ایک پل یا تھی جسے ہم پہلے اڑا چکے تھے لیکن اب وہ دوبارہ تعمیر ہو چکی تھی۔ میری نگاہیں پھر اسی پر پڑیں کیونکہ اس سے بہتر کوئی دوسری جگہ نہ ہو سکتی۔ ابھی ہم لوگ سوچ ہی رہے تھے کہ ہمیں گھر گھڑا ہٹ کی آواز سنائی دی۔ دیکھا تو کوئی دوسو گز کے فاصلے پر ٹرین آتی نظر آرہی تھی۔ اس کو دیکھ کر پہلے تو ہم بہت گھبرائے لیکن فوراً ہی سنبھل کر پلپا کے نیچے ہو گئے۔ ٹرین ہمارے سروں پر سے گزرتی رہی اور ہم لوگ دم سادھے اپنی جگہ کھڑے رہے۔ جب ٹرین کچھ دُور نکل گئی، تب باہر نکلے اور خدا کا شکر ادا کیا۔

اب میں پلپا کے اوپر گیا اور ایک ایسی جگہ، جہاں نہ پتھر نہ لکڑی کے جوڑے ہونے کے باوجود دروازہ موجود تھی، خوب اچھی طرح بارود بھر دیا۔

اس وقت کیا جائے لیکن جونہی انجن میرے سامنے پہنچا میں نے دھماکے کے لیے ایک دستہ گھما دیا۔ مگر میرے تعجب کی کوئی انتہا ہی نہ رہی جب اس سے کوئی دھماکہ نہ ہوا۔

اب میں نے جلدی میں کئی بار بینڈل کو نیچے اُپر کیا لیکن بے سود۔ اس پر میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ شاید مشینری بے کار ہو چکی تھی۔ جاتے ہوئے حواس پر قابو پا کر میں نے خود اپنا جائزہ لیا تو معلوم ہوا جس جھاڑی کو میں پناہ گاہ بنائے ہوئے تھا وہ بہت چھوٹی تھی اور میں ٹرین پر سے بالکل صاف نظر آ رہا ہوں گا۔ چنانچہ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنی جگہ کھڑا رہوں۔ ادھر ادھر جاتا تو ٹرین کے سپاہی دوسٹ میں خاتمہ کر دیتے۔ ادھر ہمارے ساتھی بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ آخر میں اپنی جگہ بیٹھ گیا اور گاڑی کو دیکھتا رہا۔ دل دھڑک رہا تھا لیکن میں چہرے سے جھوٹ موٹ کا اطمینان ظاہر کر رہا تھا۔ گاڑی اٹھلی سست رفتاری سے چل رہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کہ مرنے والی ہے۔ فوجی جوانوں نے میری طرف تو کوئی زیادہ توجہ نہ دی۔ البتہ بعض افسروں نے انگلیوں کے اشارے کیے۔ مجھے اُن کی انگلیاں راتفل کی نایاں نظر آ رہی تھیں اور یہ یقین ہو چلا تھا کہ آج خاتمہ بالخیر ہے۔ تاہم میں نے ذرا ہمت سے کام لیا اور اُن کے سامنے ہاتھ بلا بلا کر اشاروں کا جواب دیتا رہا۔ میں چونکہ خالص عرب لباس میں تھا اور اس ہدمتی کے دھتے لگے ہوئے تھے اس لیے انھیں کوئی شبہ نہ ہوا اور گاڑی

میں نے جب دیکھا کہ لوگوں میں مایوسی پھیل رہی ہے تو کچھ لوگوں کو شمال کی جانب کھنڈرات میں بھیج دیا اور کچھ کو جنوب کی پہاڑیوں کی چوٹی پر۔ تاکہ وہ چاروں طرف کی خبر رکھیں اور بروقت اشاروں سے اطلاع دیں۔ اس طرح ان کی توجہ بٹ گئی۔ موسم اتنا خراب تھا کہ کوئی کام کرنے کو جی نہ چاہ رہا تھا۔ دشمن تک اس موسم سے پریشان تھا بارش نے ہر کام خراب کر کے رکھ دیا تھا۔ دوپہر کے وقت جب بارش کچھ عقی تو مجھے جنوبی پہاڑ کی چوٹی والے آدمی نے سگنل دیا کہ ٹرین آنے والی ہے۔ اس خبر کے ملتے ہی ہم سب جھپٹ کر اپنی پوزیشن پر پہنچ گئے اور ٹرین کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ اس مرتبہ ہم کسی قیمت پر بھی ٹرین کو چھوڑنا نہ چاہتے تھے مگر نہایت مستعدی سے آدھ گھنٹے تک انتظار کرتے رہنے کے باوجود ٹرین نہ آئی۔ اب مجھ سے برداشت نہ ہوا اور میں نے پہاڑی والے آدمی سے اشاروں سے پوچھا کہ کیا بات ہے ٹرین اب تک کیوں نہیں آئی؟ اس نے جواب دیا کہ ٹرین بہت آہستہ آہستہ چل رہی ہے کیونکہ وہ بہت لمبی ہے اور انجن میں کچھ خرابی بھی معلوم ہوتی ہے میں منظر ہو گیا اور یہ سن کر تو بہت خوشی ہوئی کہ گاڑی کافی لمبی ہے کوئی ایک بجے گاڑی کی گھڑ گھڑاہٹ سنائی دی۔ گاڑی چل کیا رہی تھی بس رینگ رہی تھی کیونکہ اس پر سامان کافی لدا ہوا تھا اور چڑھائی بھی تھی۔ دس گھنٹے ہوئے ڈبوں میں فوجی بھرے ہوئے تھے، باقی بند تھے۔ میں ٹیل سے پچاس گز کے فاصلے پر چھپا ہوا یہ فیصلہ کرنے میں مصروف تھا کہ دھماکہ

چلتے چلتے پہاڑیوں میں گم ہو گئی۔

گاڑی غائب ہوتے ہی میں نے بجلی کی سی تیزی سے تمام کھلے تاروں کو ڈھانپا۔ دھماکے والے دستے کو علیحدہ کیا اور بھاگ کر ایک محفوظ پہاڑی پر چڑھ گیا۔ تھوڑی دیر میں کیا دیکھتا ہوں کر ٹرین کے انیسوں کی ایک جماعت گشت کرتی ہوئی واپس آئی اس جگہ کو بغور دیکھنے لگی جہاں میں کھڑا تھا۔ لیکن خدا کے فضل سے وہ کچھ تپانہ لگا سکے اور لوٹ گئے۔

جب میں لوٹ کر اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا تو وہاں کا نقشہ ہی کچھ اور پایا۔ وہاں باقاعدہ بحثیں ہو رہی تھیں، کچھ لوگ ہماری حمایت کر رہے تھے اور کچھ مخالفت۔ بعض لوگ تو دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ میں نے جان بوجھ کر ٹرین چھوڑی ہے اور میری نیت صاف نہیں ہے۔ صراحتیں قبیلے والے بولے کہ ”ہمارا معتقد ہی خراب ہے۔“ علی نے جب یہ جھگڑا سنا تو وہ تیز بخار کے عالم میں بھی دوڑتا ہوا نظر آیا اور دونوں کو سمجھا بھجھا کر مطمئن کیا گیا۔ اُس نے کہا کہ شریف مکہ کو اُن کے جدِ اعلیٰ کے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روشن ضمیری ورنہ میں ملی ہے اور اُن کا کہنا ہے کہ قسمت یقیناً پلٹے گی اس بات پر سب لوگ بالکل مطمئن ہو گئے عجیب بات یہ ہے کہ اس کے بعد سے سب کام بننے لگے۔ سب سے پہلے میں نے اوزار کے بغیر دھماکے والے ڈبے کو ٹھیک کر لیا۔

رات کا وقت تھا، سردی اپنے شباب پر تھی۔ کھانے کا کوئی بندوبست نہیں تھا لیکن مارے سردی کے سب کا بُرا حال تھا اس لیے کسی نے اُونٹ

کھانے کی بھی ہمت نہ کی اور بھوکے ہی سو گئے۔ علی کو ٹھنڈک لگ جانے کی وجہ سے تیز بخار ہو گیا تھا اس کے باوجود اُسے کچھ کھانے کو نہ ملا۔ وہ اوندھے مُنہ بادلہ اوڑھ کر سو گیا لیکن مجھے نیند نہ آئی۔ میں اپنے ساتھیوں کے شکوک و شبہات ختم کرنا چاہتا تھا اس لیے رات بھر اسی انتظام میں رہا کہ اب کے کوئی گڑبڑ نہ ہونے پائے۔

دوسرے روز صبح جلدی جلدی اُونٹ ذبح کر کے پکایا گیا اور ابھی صبح ناشتا کر ہی رہے تھے کہ شمال کی طرف بھیجے ہوئے چوکیدار نے ٹرین کی اطلاع دی ہم نے ناشتہ چھوڑ کر نہایت تیزی سے دوڑنا شروع کر دیا۔ افسان کی آن میں اپنی چوکیوں پر پہنچ گئے۔

پہاڑی کے موڑ سے ٹرین کا انجن آگے بڑھتا نظر آیا تو میں نے دستے پر ہاتھ رکھ لیا۔ ٹرین بہت تیز آرہی تھی۔ اس میں بارہ ڈبے تھے جن میں دو انجن کھینچ رہے تھے۔ جوہنی پہلا انجن پلٹا پر پہنچا۔ میں نے دستہ گھما دیا۔ ایک خوفناک دھماکے کے ساتھ انجن اُڑ گیا۔ میں جس قدم پر کھڑا تھا، وہاں تک زمین بُری طرح کانپ گئی۔ پہاڑوں کے پتھر ٹوٹ ٹوٹ کر ٹھہرے۔ اگر گرسے اور میرا دانا پاؤں زخمی ہو گیا اس وقت میرا سر جھکا رہا تھا تاہم میں نے پہاڑی کے اوپر بڑھنا شروع کر دیا تاکہ اپنے دوسرے ساتھیوں سے جا ملوں۔ اب میرے عرب ساتھی ٹرین پر فائرنگ کر رہے تھے اور ٹرین کے فوجی جوابی فائرنگ کر رہے تھے۔ چنانچہ میں دونوں طرف کی گولیوں کی بوچھاڑ میں آگے بڑھتا رہا مگر کہاں تک بچتا آخر



ایک گولی میرے پیر میں آکر لگ ہی گئی اور میں نیچے گر پڑا۔

علی نے جب مجھے گرتے دیکھا تو وہ بنی مصر اور دوسرے بیس آدمیوں کے ہمراہ مجھے اٹھانے کے لیے دوڑ پڑا۔ ان لوگوں نے میرے پاس پہنچ کر مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا اور اپنی جان کی کوئی پروا نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیس میں سے سات آدمی وہیں ٹھنڈے ہو گئے۔ اس دوران گولیوں کا تباہ کن ہند ہو گیا۔ میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دریا کے قریب آ گیا۔ وہاں جا کر اندازہ کیا کہ مجھے کتنی چوٹ لگی ہے۔ بغور جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ کپڑے تو بہت زیادہ پھٹ گئے تھے لیکن ہڈیاں سب صحیح سلامت تھیں۔ تمام گولیاں چھپتی ہوئی لگی تھیں جن سے زخم پڑ گئے تھے لیکن زندہ رہنے کا یقین تھا۔ اب میں نے گاڑی کی طرف نظر دوڑائی تو اس کا ایک انجن تو بالکل تباہ ہو گیا تھا اور بہت دور جا کر تھا۔ دوسرا انجن بھی ٹوٹ کر پہلے انجن کی جگہ پڑا تھا۔ اگلی تین بوگیاں بھی ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی تھیں۔ باقی ڈبے پٹری سے اتر گئے تھے اور پٹری کے دونوں جانب پڑے تھے۔ ایک ڈبہ جھنڈیوں سے خوب سجا ہوا تھا۔ اس میں آٹھویں آرمی کور کے کمانڈر محمود جمال پاشا بھی بیٹھے تھے۔ سب ملا کر کل چار سو آدمی اس ٹرین پر سوار تھے۔ ان میں سے کچھ تو ہلاک ہو چکے تھے، باقی ماندہ پوری قوت سے مدافعت کر رہے تھے۔ ایک مرحلے پر تو ایسا محسوس ہوا کہ دھوگ بھاگنے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن جن لوگوں کو میں نے شمال کی جانب تعینات کیا تھا انھوں نے فائزنگ بند کر دی اور ترک افسران ٹرین سے نکل کر

بھاگنا شروع ہو گئے۔ سینٹے نے اپنی گھوڑی پر ان کا پیچھا کیا لیکن وہ اس قدر جوش میں تھا کہ گولی نہ چلا سکا چنانچہ وہ صاف پنچ نکلے۔ اب باقی عرب سپاہیوں نے زمین پر پڑے ہوئے تمغے اور دوسرا سامان اٹھانا شروع کر دیا۔ بعد میں ٹرین کے ڈبوں میں گھس کر وہاں سے بکس اٹھا اٹھا کر لانے لگے۔

سینٹے اور آضوب وہاں سے فارغ ہو کر میرے پاس آئے تو میں نے ان سے فہاد کی خیریت پوچھی۔ ایک عرب نے بتایا کہ سب سے پہلی گولی اُسی نے چلائی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے ٹرین سے ایک گولی اس کے آکر لگی اور وہ جاں بحق ہو گیا۔ اس نے فہاد کی بیٹی اور رائفلی بھی بطور ثبوت دکھائی اور کہا کہ میں نے اُسے بچانے کی بہت کوشش کی۔ ابھی یہ گفتگو جاری ہی تھی کہ آضوب جو بالکل چپ کھڑا تھا بھاگتا ہوا پاٹری سے نیچے اترنے لگا اور دریا کے قریب پہنچ کر اُس نے ایک لاش کو کھینچنا شروع کر دیا۔ یہ منظر دیکھ کر سینٹے بھی اپنی گھوڑی پر سوار ہو کر وہیں پہنچ گیا۔ دونوں نے مل کر اس لاش کو گھوڑی پر سوار کیا۔ دراصل یہ فہاد تھا جو ہلاک تو نہیں ہوا تھا البتہ بے ہوش تھا۔ ایک گولی اُس کے منہ کو چھیدتی ہوئی نکل گئی تھی، اُس کے چار دانت ٹوٹ گئے تھے اور زبان پاش پاش ہو گئی تھی۔ ان دونوں کے پہنچنے کے بعد اُسے کچھ ہوش آیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے منہ کا خون صاف کیا، آہستہ سے آنکھیں کھولیں اور دونوں کی مدد سے گھوڑی پر سوار ہو گیا۔

ہم لوگ ادھر اپنے زخمیوں میں مصروف تھے ادھر ترکوں کو موقع مل گیا وہ چپکے چپکے اگے بڑھنے لگے جب وہ تقریباً آدھا فاصلہ طے کر چکے تو ہمارے

سپاہیوں نے پھر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی جس کے نتیجے میں بیس افراد ہلاک ہو گئے۔ ٹرین کے آس پاس کا علاقہ لاشوں سے پٹ گیا تھا لیکن تھے وہ بھی بڑے جرمی، ابھی تک انھوں نے ہار تسلیم نہیں کی تھی۔

میں نے جب دیکھا کہ جنگ کسی صورت بند نہیں ہو رہی ہے اور فائرنگ ٹرین کی فوج کے کمانڈر کے حکم پر برابر جاری ہے تو خود مجھے اپنے روتے کے بارے میں غور کرنا پڑا کیونکہ اب میرے پاس صرف چالیس آدمی رہ گئے تھے جن میں زخمی بھی شامل تھے۔ ممکن تھا کہ دشمن غالب آجائے اور ہم سب کو اپنی جانوں سے ہاتھ دھوئے پڑتے۔ اس لیے میں نے مناسب یہ سمجھا کہ ہم خود ہی یہاں سے نکل جائیں۔ چنانچہ میں نے واپسی کا حکم دے دیا اور تمام عرب سپاہی پہاڑ کی چٹانوں کی آڑ میں پہاڑ کی چوٹی کی طرف بڑھنے لگے۔ دشمن کو اپنی جگہ روکے رکھنے کی خاطر وہ پیچھے مڑ مڑ کر فائرنگ بھی کرتے جاتے تھے۔ پہاڑ کی چوٹی پر ہمارے آؤنٹ بندھے تھے۔ سب لوگ اپنے اپنے آؤنٹوں پر سوار ہوئے اور دوڑ لگانی شروع کر دی۔ پانچ میل کے فاصلے پر ہم نے وادی ضلیل میں جا کر دم لیا اور تین دن کے بعد اپنا کھانا تیار کیا۔ زخمیوں کی مرہم پلا سے فراغت پا کر جو مال غنیمت ہاتھ آیا تھا اسے تقسیم کیا۔ نتیجے میں روانگی کے وقت جس کے پاس صرف پتھر تھے اب وہ دور انفلوں کا مالک ہو گئے تھے۔ اس کے بعد ہلاک شدگان کے درمیان کے معاوضے اور بہادر سپاہیوں کے لیے انعامات کا اعلان کیا گیا اور پھر ہماری جماعت اذکر جاپنچی جہاں ہمارے عظیم الشان استقبال کیا گیا اور لوگوں نے فاتح اعظم اور اس جیسے دوسرے خطابوں سے نوازا حالانکہ ہم لوگ ان خطابات کے قطعی مستحق نہ تھے۔

## ۶۔ دو شاہین صفت ہوا باز

فضائی جنگ آج ایک فن بن چکی ہے اور فضائی فوج کے تعاون کے بغیر بری فوج ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتی۔ آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے اس کو یہ اہمیت حاصل نہیں تھی۔ پہلی جنگ عظیم میں پہلے پل برطانوی فضائیہ نے اس کا مظاہرہ کیا اس سلسلے میں دو ہوا بازوں کے نام رہتی دنیا تک باقی رہیں گے جن کی بہادری، جرأت اور فضائی مہارت نے فضائیہ کو برتری عطا کر دی۔

یہ ہوا باز میکوڈن اور مینک ہیں۔

عجیب اتفاق ہے کہ دونوں نے فوج کی ملازمت ایک ساتھ شروع کی، دونوں پہلے مینک بنے بعد میں ہوا باز، دونوں نے علیحدہ علیحدہ دشمن کے پچاس ہماز تباہ کیے حتیٰ کہ دونوں کا انتقال بھی فرانس میں ایسے وقت پر ہوا جبکہ ان کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ غالباً اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بہادر لوگوں کی زندگیاں تقریباً ایک جیسی گزرتی ہیں۔ میکوڈن کینٹ میں پیدا ہوا تھا اس کے باپ بھی فوج کی ملازمت میں تھے۔ اس نے ۱۹۱۳ء میں رائل فلائنگ کوریس شمولیت اختیار کی۔

ہامور ہوا بازوں کی انجمن فلائنگ سرکس میں ایک زلزلہ آگیا اور سچ تو یہ ہے کہ اب جرمن فضائیہ کی جارحانہ قوت کا خاتمہ ہو گیا تھا۔

یوں تو میکوڈن اپنی تمام زندگی فضائی مقابلوں میں حصہ لیتا رہا لیکن اس کا ایک مقابلہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ ایک مرتبہ وہ اپنے طیارے پر تنہا اڑان بگڑ رہا تھا کہ اچانک دشمن کے پانچ جہازوں نے اس کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اب تو وہ بڑا پریشان ہوا لیکن اس نے ہمت نہ ہاری، شیر کی سی گھن گرج کے ساتھ طیارے کو فضا میں دوڑانا شروع کیا اور بندوقوں کو بھی چلا دیا۔ اس کا جہاز ایس ای (SE) کہلاتا تھا۔ اس کی پھرتی اور ہوش مندی سے دشمن کے جہاز قریب نہ پھٹے۔ ایک گھنٹے تک فضا میں آنکھ بھولی ہوتی رہی۔ بالآخر میکوڈن فتح یاب ہوا۔ دشمن کے ایک جہاز کی کمر ٹوٹ گئی اور وہ نیچے گر کر پاش پاش ہو گیا۔ دوسرے جہاز کے ہوا باز کا غالباً دماغی توازن خراب ہو گیا۔ نتیجتاً جہاز کا کنٹرول بگڑ گیا اور وہ چکر کھاتا ہوا نیچے چلا گیا۔ تیسرے جہاز کے ایندھن میں آگ لگ گئی۔ جہاز دیکھتے ہی دیکھتے آگ کا گولہ بن گیا اور یہ گولہ پہاڑوں پر جا کر اچوتھا جہاز بھی نیچے آ رہا۔ اس کے گرنے کی وجہ سمجھ میں نہ آئی البتہ یہ دیکھا گیا کہ وہ ایک دادی میں نوک کے بل غودا گھڑا ہے۔ پانچواں جہاز بھی میکوڈن کی گولیوں کی تاب نہ لا سکا اور گھاٹیوں کی نذر ہو گیا۔ میکوڈن اپنے جہاز کو صحیح سلامت واپس لے آیا۔ اس ایک مقابلے سے اس کی مہارت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

حکومت برطانیہ نے اس کی خدمات کے اعتراف کے طور پر اسے

وہ سب سے پہلا شخص تھا جس نے پہلی جنگ عظیم کے دوران انگلینڈ سے فرانس کا سفر کیا۔ ابتداءً وہ میکینک تھا لیکن جنوری ۱۹۱۷ء میں ہوا بازوں میں شامل ہو گیا۔ اسی میں اس کی صلاحیت کے جوہر کھلے۔

اس کا پہلا فضائی معرکہ نومبر ۱۹۱۷ء میں ہوا۔ اس زمانے میں جرمنی کے ایٹروز جہازوں کا بڑا نام تھا۔ اس کے چھ جہازوں نے بیک وقت ایک ترتیب سے حملہ کر دیا۔ میکوڈن تو پہلے ہی تیار تھا، وہ اپنے دوساتھیوں کو لے کر مقابلے کے لیے اڑ گیا۔ دیاں پہنچ کر اندازہ ہوا کہ بغیر ساتھیوں کے وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ بہر حال اس نے بڑی بے جگری سے دشمن کے جہازوں کا مقابلہ کیا اور انہیں مار بھگایا۔ اس آدھ گھنٹے کے مقابلے میں اس کے تیس زخم آئے۔ ان زخموں کا اسے بہت افسوس ہوا اور اس نے طے کر لیا کہ آئندہ کبھی وہ اتنے زخم نہیں کھائے گا کیونکہ زخم کا لگنا اس کے نزدیک مہارت کی کمی پر دلالت کرتا تھا۔ اور واقعی اس کا عزم پورا ہوا اور پھر کبھی اس کے اتنے زخم نہیں آئے۔

مختصر یہ کہ اس کی زندگی اسی قسم کے مقابلوں میں گزری۔ جرمنی کا ایک بہت مشہور ہوا باز تھا جس کا نام لینینٹ ورز فاس تھا۔ جرمنی میں ہر طرف اسی کی دھوم تھی اور واقعی وہ دنیا کا مانا ہوا پائلٹ تھا۔ میکوڈن نے بڑے حوصلے کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا۔ فاس نے ہوا بازی کے تمام گراں استعمال کیے، لیکن میکوڈن کے شاہنشاہی صفت حملوں کی تاب نہ لا سکا اور اپنے طیارے سمیت پہاڑیوں میں جا گرا۔

فاس کے ہلاک ہوتے ہی ہر طرف میکوڈن کی شہرت ہو گئی، جرمنی کے

کی اور نیو پورٹ نامی جہازوں سے جرمن طیاروں پر بڑھ بڑھ کر حملے کیے۔ اسی طرح ایک دوسرے موقع پر البروز لڑاکا طیاروں پر بھیجے سے حملہ کیا۔ ان کے جہازوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ مینک کے جہاز نے فضا میں غلطے لگانے کا ایک نیاریکارڈ قائم کیا، یعنی دس ہزار فٹ کی بلندی سے دو ہزار فٹ کی بلندی تک اچانک غوطہ اڑھ پھر بلندی کی طرف پرواز، ساتھ ہی بندوقوں کی گھنگج ایک عجیب ہولناک منظر تھا! البروز میں آگ لگتی اور دھوئیں کی لکیر زمین تک کھینچی چلی جاتی۔ آخر تھوڑی ہی دیر میں اُس نے اپنی برتری کا لوہا منوالیا۔ اُس کی زندگی اس قسم کے واقعات سے بھری بڑی ہے۔ میکوڈن کی طرح اس کو بھی سلسلہ میں ٹریننگ اسکول بھیج دیا گیا جہاں اس کی ملاقات میکوڈن سے ہوئی۔ لیکن اُسے وہ زندگی قطعی پسند نہ آئی، جلد ہی وہ اجازت لے کر میدان جنگ میں واپس آگیا اور ایک بار پھر اس کی جرات، جسارت اور فن کے ہر طرف چرچے ہونے لگے۔

۲۱ مئی ۱۹۱۸ء اُس کی زندگی کی ایک یادگار تاریخ تھی۔ اُسے یوم مینک کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اُسے اچانک اطلاع ملی کہ دشمن کے چھ جہاز فالز فائٹر کیل بل سے مشرق کی طرف آرہے ہیں۔ مینک کی رگوں میں خون دوڑنے لگا۔ چند ہی منٹ بعد وہ ان جہازوں کے مد مقابل تھا۔ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر مورچہ ہوا۔ ایک گولی دشمن کے ایک جہاز کی دُم پر لگی اور ایک زوردار دھماکے کے ساتھ جہاز ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ پھر اُس نے دوسرے جہاز کو ٹاڑا، گولی چلائی، فالز طیارہ تباہ ہوا اور اُس کا اگلا حصہ

و کٹوریہ کر اس عطا کیا اور اُسے میجر کے عہدہ پر ترقی دے دی۔ بعد میں حکومت نے اس کے غیر معمولی فن سے زیر تربیت کینڈٹوں کو روشناس کرانے کے لیے ٹریننگ اسکول میں تعینات کر دیا۔ وہ اپنی نئی ذمہ داری سنبھالنے جا رہا تھا کہ ہوائی اڈہ پر ایک حادثے کا شکار ہو گیا اور اس طرح فضائی جنگ کا ایک شاندار باب ختم ہو گیا۔

مینک بھی میکوڈن کا مبعصر تھا اور کسی صورت اس سے کم نہ تھا۔ بعض لوگ تو اُسے میکوڈن سے بھی بڑا خیال کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ لوگ صحیح کہتے ہوں۔ بہر حال وہ ہوا باز ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم انسان بھی تھا اُسے اپنے مقصد سے لگن تھی۔ وہ سورج کی طرح ایمان دار اور پابند کی طرح نرم دل تھا۔ البرٹ بال کی زندگی اس کے لیے ایک آدرش تھی جو ہوا بازی کا ایک مانا ہوا سپاہی تھا۔ وہ ہمیشہ بال کے کارناموں کو پڑھتا اور اپنے حوصلے کو بڑھاتا رہتا۔ اس کا دین، ایمان سب کچھ بال تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ دیکھنا ایک نیا بھی بال بن جاؤں گا۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران ایک وقت ایسا بھی آیا جبکہ جرمن ہوا باز فضا پر چھا گئے۔ اتحادیوں کے چپکے چھوٹ گئے۔ ان کے متعدد ہوا باز ہلاک ہو گئے، بقیہ اتنے دہشت زدہ ہوئے کہ ان میں اُڑنے کی بھی ہمت نہ ہوئی۔ ایسے وقت میں مینک کی دلیری نے جنگ کا نقشہ الٹ دیا۔ اُس نے جب یہ دیکھا کہ دشمن کی خندقوں میں جگہ جگہ یہ اعلان لکھ کر لگایا گیا ہے کہ خدا کے واسطے اپنے ہوا بازوں کو آرام کا موقع دو۔ تو اُس نے اپنی بڑی تھوٹک محسوس

ہی کر دکھایا۔ ایک سہ پہر کو وہ سینٹ عمر کے ہوائی اڈہ پر دوستوں میں کھڑا خوش گیتیاں کر رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر نیوزی لینڈ کے ایک نوجوان انگلش پیر پری جو خود بھی بڑا ماہر ہوا باز تھا اور مینک کو ٹری عقیدت سے دیکھتا تھا۔ مینک نے اُس سے کہا کیا بھی تمہارا مقابلہ کسی ٹین ٹیبل سے ہوا ہے؟ نوجوان نے گھبرا کر جواب دیا نہیں جناب، اب تک تو ہوا نہیں۔

مینک نے کہا: اچھا تو آج ہو جائے مقابلہ پھر اس نے دوسروں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کیا آپ چند منٹ کے لیے ہیں معاف فرمائیں گے۔ یہ کہہ کر وہ انگلس کو ساتھ لیے رن وے کی طرف بڑھا۔ پھر اس نے انگلس سے کہا: اپنا جہاز رے چلو۔ انگلس نے جہاز اسٹارٹ کیا تو اسے معلوم ہوا کہ انجن میں کچھ خرابی ہے۔ جہاز اوپر نہیں اٹھ سکتا۔ چنانچہ انگلس نہ جاسکا اور مینک اکیلا ہی اُڑ گیا۔ ادھر انگلس رن وے پر ہی چل قدمی کرتا رہا اور دل ہی دل میں دشمنیں مانگتا رہا کہ مینک کو کچھ نہ ہوا اور وہ بحیریت واپس آجائے۔ انگلس کی دعا قبول ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد مینک اپنی زندگی کا ۷۳ واں ٹین ٹیبلارہ تباہ کر کے واپس آ گیا۔

دوسرے دن صبح تڑکے دونوں پہر ایک ساتھ اپنے اپنے طیاروں پر فصائیں پہنچ گئے اور دشمن کے علاقوں میں گھس گئے۔ اب کے اُن کا مقابلہ دشمن کے دو نشستوں والے جاسوس طیارے سے ہوا۔ یہ برطانوی خندقوں کا پتہ لگاتا تھا۔ مینک نے اس کا مقابلہ کیا اور نیچے سے گولی چلائی۔ چند ہی لمحوں میں جہاز نے دم توڑ دیا۔ مینک نے انگلس کو اشارہ کیا اور خود بھی نیچے اتر گیا۔

زمین کے اندر جا کر دھنس گیا۔ اب جرمن جہاز اُس کے بالکل قریب آ گیا تھا لیکن مینک جھٹ اپنی پسندیدہ جگہ یعنی دم کے قریب پہنچ گیا اس جہاز نے ایک طرف کو خم کھایا پھر سیکنڈوں فٹ نیچے چلا گیا۔ یہاں پہنچ کر وہ پھر سیدھا ہوا نیچے سے مینک کے جہاز پر کئی فائر کیے اور اپنے جہاز کو گردش دیتا رہا تاکہ مینک کی گولیوں سے محفوظ رہے۔ مینک نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا یعنی وہ اپنے طیارے کو مسلسل گردش دیتا رہا۔ وہ جب مناسب پوزیشن میں آتا تو ایک گولی داغ دیتا مینک کے ساتھی اس مقابلے کو زمین سے دیکھتے رہے جیسے کوئی پیچ دیکھ رہے ہوں۔ جرمن طیارے نے چکر لگایا۔ مینک نے بھی ایسا ہی کیا۔ آخر جرمن طیارے نے دوبارہ فصائیں غوطہ لگایا مگر مینک نے ساتھ نہ چھوڑا۔ اس کا طیارہ جزبہ کی طرح دشمن کے طیارے کے ساتھ چمٹا ہوا تھا۔ اب تو جرمن جہاز بڑا پریشان ہوا۔ وہ چاہتا تھا کہ مینک کسی صورت سے اپنا جہاز سامنے لے آئے لیکن مینک نے کوئی ہتھی گولیاں تو نہیں کھلی تھیں۔ جب جرمن جہاز اپنے جہاز کو ادھر ادھر لے جاتا تو مینک بھی اُس کے ساتھ ساتھ بچتا اور موقع لگتے ہی فائر کر دیتا کافی دیر تک یہ مقابلہ ہوتا رہا۔ دونوں میں سے کوئی بھی مغلوب نہ ہوا۔ آخر کار جرمن جہاز سے ایک خطرناک غلطی ہو گئی اُس نے اپنے جہاز کو اتنا موڑ لیا کہ پچھلا حصہ نظر آنے لگا بس پھر کیا تھا مینک نے فوراً ایک گولی چلا دی اور اس گولی کے ساتھ ہی مقابلہ ختم ہو گیا۔ فالز طیارے کے برچھے اُلٹ گئے۔ دشمن کے باقی جہاز پہلے ہی بھاگ گئے تھے۔ اس طرح یہ فصائی معرکہ مینک کی فتح پر ختم ہوا۔ اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد اُس نے اپنے ایک دوست کو خط لکھا جس میں اپنے اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ یا تو میکوڈن کا ریکارڈ توڑے گا یا اس کو شش میں اپنی جان دے دوں گا۔ چنانچہ اُس نے جیسا کہا تھا ویسا

تاکہ جرم خندقوں کا پتہ لگایا جاسکے مگر جوہنی وہ نیچے پہنچا، رائفل کی گولیوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ ایک گولی اُس کے سر میں سے گزر گئی۔ دوسری نے جہاز کو آگ کے شعلوں میں تبدیل کر دیا۔ دوسری طرف انگلش کے طیارے کی ٹپل کی ٹپکی بھی گولیوں سے پھٹ گئی۔ اس طرح صبح کے تارے کے ساتھ یہ دونوں تارے بھی مابقی ملکِ عدم ہو گئے۔

لیکن مینٹک نے اپنے عزم کو پورا کر دکھایا — !

## ۴۔ مجاہدِ رلیف، غازی عبد الکریم

تاریخ کا دیانت داری سے جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح طور پر محسوس ہوگی کہ بیشتر جنگیں بے بات کی بات کی طرح لڑی گئیں اور فتوحات ہمیشہ اپنے جلو میں نقصانات اور تباہ کاریاں لے کر آئیں تاکہ تاریخ جنگی واقعات سے پر ہے اور بیسیویں صدی کی دو ہولناک جنگوں سے بھی جنھوں نے تمام دنیا کو اپنی پیٹ میں لے لیا انسان کی آنکھ نہ کھلی۔

پہلی جنگ عظیم میں ان فرانسیسی نوآبادکاروں کی جنگی داستان پیش کی جا رہی ہے جنھوں نے پہلی جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد مراکش اور شمالی افریقہ کے متعدد ممالک میں عسکری دبدبے کا مظاہرہ کیا اور وہاں کے عوام کے ذریعہ حریت کو کچلنے کے لیے ہر ممکن اقدام کیا لیکن منظم افواج اور ان کے جدید ترین آلات جنگ عوام کے سیل بے پناہ کے سامنے بے کار ثابت ہوئے۔

فرانس نے پہلی جنگ عظیم کے فوراً بعد بیرونی نوآبادیوں میں اپنی طاقت بڑھانا شروع کر دی تھی۔ جرمنی اور آسٹریا کے باشندوں کو بھی عروجی ملازمت کے خواہش مند تھے، انھی افواج کے ساتھ منسلک کر دیا گیا تھا۔ اس طرح پانچ رجمنٹ فوج اکٹھی ہو گئی تھی جس میں سے بیشتر کوہ قش

میں تعینات کیا گیا۔ سپاہیوں کی تعداد کم و بیش ۲۵ ہزار بتائی جاتی ہے جو فرانسیسی جنرل لائٹے کی کمان میں تھی۔ اُس نے جنگ کے دوران میں ہی ملک کے طول و عرض میں اچھی طرح قدم جما لیے تھے۔ حالانکہ دنیا کو یہ بتایا جا رہا تھا کہ فرانس کی حیثیت صرف مددگار اور مشیر کی ہے، اصل طاقت اہل مراکش ہی کے پاس ہے اور وہ اپنے مہلات میں خود مختار ہیں۔ لائٹے بڑا مدبر بھی تھا اُس نے جس طرح ممکن ہوا فرانس کے مفاد کی حفاظت کی۔ مراکش کے چھوٹے چھوٹے سرداروں میں آپس میں لڑایا لیکن بعضوں کے پیسے اور ریاست جاگیر کا لالچ دیا، بہ صورت اپنا اتو سیدھا کیا لیکن ہر فرعون نے راموسی آخر مراکش کی وادیوں سے ایک فوج ان اٹھا اور اُس نے فرانسیسی اتحاد کے خلاف آواز اٹھایا۔ یہ فوجان محمد عبدالکریم الخطابی تھا۔ اس مجاہد نے بیک وقت فرانس اور اسپین کی طاقتوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ یہ ریف کاربنے والا تھا اور بربر قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے والد ریف کے ایک بہت بڑے سردار تھے۔ انھیں بڑی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ بیٹے کو انھوں نے اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی جس نے قانون کی ڈگری لینے کے بعد بربر زبان سکھانے کی ملازمت اختیار کر لی۔ اس زمانے میں مراکش کے ایک حصے پر اسپین والوں کا بھی قبضہ تھا۔ چنانچہ وہ اسپین کے افسران کو بربر زبان سکھانے لگا۔

اس کو اپنے وطن میں غیر ملکیوں کا وجود ہمیشہ سے ناپسند تھا اور قوی جذبہ اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ مضبوط قوت ارادی اور تشیخ جذبات اس کے لیے قدرت کا عطیہ تھے جو اس کو حین لینے نہ دیتے

ایک مرتبہ وہ بربر زبان کی کلاس لے رہا تھا کہ ایک اسپینی جنرل سلوٹر کی کسی بات پر سخت برا فردختہ ہو گیا۔ آقا کے خلاف زبان کھولنے سے بڑا جرم اور کیا ہو سکتا ہے اُسے فوراً گرفتار کر کے جیل کی کال کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا اور اس کی گرفتاری مراکش کی آزادی کی نقیب بن گئی۔ یہ ۱۹۲۱ء کا واقعہ ہے۔

لیکن اس کی یہ قید عارضی ثابت ہوئی۔ وہ ہوا کی طرح آزاد تھا، اُسے چار دیواری کا پابند کرنا نادانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ محسوس سے دو تین ہفتے گزرے ہوں گے کہ وہ رات کی تاریکی میں جیل سے فرار ہو گیا اور فرانسیسی فوجیں اپنے تمام وسائل کے باوجود اُس کو پکڑنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ کچھ عرصہ بعد خبر ملی کہ وہ اپنے وطن پہنچ گیا اور کسی نامعلوم پہاڑی علاقے میں آزاد سپاہیوں کی تنظیم کر رہا ہے اور حقیقتاً جلد ہی اُسے ریف اور مور لوگوں کی حمایت حاصل ہو گئی کیونکہ وہ غیر ملکی فوجیوں کے ظلم و بربریت سے تنگ آ چکے تھے اور بہ صورت ظلم کے خلاف صف آراء ہونا چاہتے تھے عبدالکریم ان کے اندھیروں میں روشنی کی کرن کی طرح چمک اٹھا۔

آزادی کے یہ متوالے سال ختم ہونے تک باقاعدہ منظم ہو چکے تھے۔ ان کا ہر سپاہی جان لینے اور جان دینے کو اپنا ایمان تصور کرتا تھا عبدالکریم مجاہد ریف کی یہ تنظیم اس قدر وسیع تھی کہ اس میں باقاعدہ جاسوسی کا بھی ایک شعبہ تھا جو دشمنوں کی خبریں جلد از جلد اُس کے پاس پہنچاتا چنانچہ اسی زمانے میں کسی جاسوس نے اطلاع دی کہ اسپینی جنرل سلوٹر وہ ایک دوزخ میں اپنی ایک چوکی کے مٹانے کے لیے آنے والا ہے۔ یہ وہی جنرل تھا

جس سے ساف گوئی پر عبدالکریم کو سزا دی گئی تھی۔ اس مجاہد نے بغیر کہ خاص تیاری کے اپنے چند ساتھیوں سمیت اس چوکی پر حملہ کر دیا۔ کہا ہے کہ اس کے ہمراہ جو لوگ تھے ان میں صرف چند کے پاس رائفلیں تھیں بقیہ تمام لوگ لاٹھی، ڈنڈوں، نیزوں اور جاتوؤں سے لیس تھے۔ مادی وسائل نہ ہونے کے باوجود انھوں نے صرف جوش ایمانی کی قوت پر چوک کو تاراج کر دیا۔ جنرل سلوٹر بھی اپنی جان بچانہ سکا۔ سینکڑوں اسپانیسی سپاہی قتل ہوئے۔ چند سپاہی بمشکل تمام جان بچا کر بھاگ سکے جنھوں نے ہیڈ کوارٹر پہنچ کر داستان الم بیان کی۔ اسپین کی ۱۹ ہزار فوج میں اس اطلاع کے پہنچتے ہی ایک کھلبلی مچ گئی۔ ان کی بہتیں جواب دے گئیں۔ عبدالکریم نے اپنے ساتھیوں سمیت آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ اس پیش قدمی کے ساتھ ساتھ اسپین کے فوجی اپنی چوکیاں چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ اداہر عبدالکریم کے ساتھیوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور اسپین والوں کے لیے بس دہری راستے رہ گئے تھے کہ یا تو وہ عبدالکریم اور اس کے ساتھیوں کی اطاعت قبول کر لیں یا ہمیشہ کی مانند سرجائیں۔ مجاہدین ریف بڑھتے بڑھتے ملیہ (MELILLA) کی حصار تک پہنچ گئے۔ اس شہر میں پچاس ہزار یورپا باشندے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ ان کا صفایا کر دیا جائے، لیکن غازی عبدالکریم نے یہ بات بہادری کے خلاف سمجھی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو سختی سے منع کر دیا اور کہا کہ ہماری لڑائی حکومت اور فوج سے ہے۔ عام بے گناہ انسانوں کو مار کر ہمیں کیا ملے گا۔ چنانچہ اس نے فوراً

واپسی کا حکم دیا اور سب لوگ بخیریت ریف کی پہاڑیوں میں پہنچ گئے۔ اسی دوران میں ایک اہم واقعہ پیش آیا کہ بیرونی افواج کے ایک سارجنٹ بیکس کے دل میں قوم پرستوں سے بہادری کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے غیر انسانی مظالم سے تنگ آ چکا تھا چنانچہ فوج کی ملازمت چھوڑ کر عبدالکریم کے پاس آ گیا۔ مگر اس تک پہنچنے سے قبل مقامی قبائل نے اُسے پکڑ لیا اور قریب تھا کہ وہ اُسے زندہ دفن کر دیتے لیکن قبیلے کے سردار نے سارجنٹ کی باتوں سے اس کی وفاداری کا اندازہ کیا اور اس کو عبدالکریم کے پاس لے جایا گیا جہاں پہنچ کر اُس نے اپنے سابقہ مظالم کی معافی چاہی اور اس کے ہاتھ پر قبول اسلام کیا۔ سارجنٹ کا اسلامی نام حج الایمن رکھا گیا اور قبیلے کے سردار کی لڑکی سے اس کی شادی کر دی گئی۔ قوم پرستوں کی صفوں میں اس کی شمولیت سے بڑا جوش پھیل گیا اور اس جوش میں اس وقت اور اضافہ ہو گیا جب حج الایمن نے جدید فوجی طریقے پر ان کی تنظیم کی اور انھیں کسی منظم فوج سے لڑنے کے قابل بنا دیا۔ وہ بڑا اچھا آدمی تھا۔ اس کا دل رحم و مسرت کے جذبات سے بھر پور تھا۔ وہ ہمیشہ قتل و خونریزی سے بچتا تھا اور دوسروں کو بھی اسی کی نصیحت کیا کرتا تھا۔

غرض اب نہر طرف عبدالکریم کی بہادری اور جنگجوئی کے چرچے تھے۔ اور بیرون ملک بھی اس کی مقبولیت بڑھتی جا رہی تھی۔ عبدالکریم اتنا خوددار تھا کہ اس نے کبھی کسی دوسرے ملک سے مالی یا فوجی امداد نہیں مانگی۔ وہ اپنی قوت پر بھروسہ کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر ہم خود اپنے لیے کچھ نہیں



کر سکتے تو دوسروں سے مدد کی توقع کرنا بحث ہے۔ چنانچہ اس نے جو بھاری بھی استعمال کیے وہ یا تو دیسی ساخت کے تھے یا اسپین کے سپاہیوں سے خریدے۔ یہ خوبی اس بطل حریت میں اتنی بڑی تھی کہ دوسروں میں شک نظر آنے لگی۔ اس کے دوسرے ساتھیوں نے اس سلسلے میں بڑی مہارت ثبوت دیا۔ وہ ہر مہم میں اس طرح حصہ لیتے تھے گویا عرصہ دراز تک اس کی تربیت حاصل کر چکے ہیں۔ جو اسلحہ اور سامان جنگ ہاتھ آتا اُسے بخوبی استعمال کر لیتے۔ یہاں تک کہ ایک موقع پر ایک ۴ سالہ لڑکے نے ٹیلیفونی مواصلات کے وسیع جال کو اس طرح ٹھیک ٹھیک استعمال کیا جیسے کہ کوئی ماہر انجینیئر ہو۔

مقوڑے ہی دنوں کے اندر اندر عبدالکریم اور اس کے ساتھیوں نے پے درپے حملوں سے اسپینی افواج کے چھکے چھڑا دیے اور جلد ہی وہ وقت بھی آگیا جب وہ واقعی اسپینی مراقش کے حکمران اعلیٰ بن گئے، مراقش کے عام باشندوں کو اُمید بندھ گئی کہ اب وہ اپنے وطن کو غیر ملکی فوجوں کے ناپاک وجود سے پاک کرالیں گے۔

اسپین کے بعد فرانسیسی افواج کا نمبر تھا۔ عبدالکریم نے پورے جوش و خروش سے فرانسیسی چوکیوں پر حملے کرنے شروع کر دیے۔ یہاں بھی کامیابی اس کے قدم چومنے لگیں۔ کیونکہ اس کے سامنے ایک مقصد تھا جس کو وہ اپنے قومی وطنی جذبات سے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھی کوئی تنخواہ دار ملازم نہ تھے، نہ انھیں کسی افسر کی خوشنودی منظور تھی، وہ تو بس

اللہ کے نام پر اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے میدان میں نکلے تھے۔ اسپینی افواج کی شکست نے ان کے حوصلے بڑھا دیے اور وہ طوفان کی طرح بڑھنے لگے۔ دشمن خاص و عاشاک کی طرح مہم چلے جا رہے تھے۔ اور فرانسیسی افواج میں ایک کھلبلی پڑی ہوئی تھی۔ آخر جنرل لائٹے کی تمام سیاست اور چال بازیوں خاک میں مل گئیں۔ اُس نے اپنی حکومت کو تجویز بھیجی کہ فرانس اور اسپین کی فوجیں متحد ہو کر ان سر فر وشنوں کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ انتہا مقابلہ کرنے میں فرانس والوں کا بھی وہی حشر ہو گا جو اسپینی افواج کا ہو چکا ہے۔ اس تجویز کو حکومت فرانس نے فی الفور منظور کر لیا اور اسپین کی حکومت سے مل کر مشترکہ فوجی کمان قائم کر دی گئی۔ فرانس نے جنرل لائٹے کو واپس بلا لیا اور اس کی جگہ فرانسیسی افواج کا انسپکٹر جنرل، مارشل پیٹن مراقش بھیج دیا گیا۔ اس کو ملک کا سب سے بڑا تجربہ کار اور ماہر فوجی افسر خیال کیا جاتا تھا۔ اسپین نے مارشل پرانمودی ریوراکو مشترکہ کمان کے لیے بھیجا تھا۔

۱۹۲۴ء تک مجاہدین اور غیر ملکی افواج کے درمیان جنگ ایک خطرناک موڑ پر پہنچی۔ اسی دوران میں ایک اور واقعہ رونما ہوا۔ ایک کارواں فرانسیسی افواج کے لیے سامانِ رسد لیے جا رہا تھا جو تشوکت کے مقام پر مجاہدین ریف کے گھیرے میں آگیا اور اس کا سارا سامان لوٹ لیا گیا۔ بہر حال ایک سال تک مسلسل جھڑپیں چلتی رہیں۔ ۱۹۲۴ء میں عبدالکریم نے تیس ہزار مجاہدین کے ساتھ تازہ کی پٹی پر واقع فرانسیسی قلعوں پر بار بول دیا۔ ان قلعوں کی تعداد ۶۶ بتائی جاتی ہے۔ ان میں سے نو پر مجاہدین کا قبضہ ہو

گیا تیس سے زیلوہ ویران ہو گئے اور فرانسیسی فوجی قلعے چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔

عبدالکریم فطرارحم دل اور وسیع انظر تھا اس نے گرفتار شدہ فرانسیسی اور اسپینی سپاہیوں میں عام معافی کا اعلان کر دیا اور سب کو یورپ بھجوانے کا بندوبست بھی کر دیا۔ اس کے اس اعلان سے قیدیوں پر بڑا اچھا اثر پڑا بے شمار قیدیوں نے حمد کیا کہ وہ واپس جانے کے بجائے حریت پسندوں کا ساتھ دیں گے۔ ایسے ہی قیدیوں میں ایک نیگرو بھی تھا جس کا نام ویسے ولیمز تھا۔ وہ کیلی فورنیا کا رہنے والا تھا اور تلاش معاش میں فرانس آ گیا تھا جہاں سے حکومت نے اس کو بیرونی فوج میں سپاہی بنا کر بھیج دیا تھا۔ اس نے عبدالکریم کی عطا ہونے والی اور اسے شکر بنانے پر مامور کر دیا گیا۔ ایک دن وہ شکر بنا رہا تھا کہ اس کی ملاقات ایک امریکی مصنف سے ہو گئی جو بہت پریشانی کے عالم میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ اس کا نام شیان تھا۔ وہ ایک ایک پیسے کو محتاج تھا اور بھجار سے اس کا پنڈا اچھنکا جا رہا تھا۔ ولیمز نے اس کے ساتھ بڑی ہمدردی کی۔ اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ اس کا دوا علاج کیا اور وہ اچھا ہو گیا۔ ایک دن بدھتی سے دونوں ٹپلتے ہوئے آزاد علاقے میں نکل گئے۔ فرانسیسی فوجی دستے نے دونوں کو دیکھ لیا اور گرفتار کر لیے گئے۔ ولیمز کو امید تھی کہ اسے سزائے موت دی جائے گی لیکن شیان کی رفاقت کام آگئی۔ اس نے فرانسیسی حکام کو دھمکایا کہ اگر انھوں نے نیگرو کو سزائے موت دی تو امریکی اخبارات میں ان کے خلاف زبردست پروپیگنڈہ ہوگا اور ممکن ہے کہ امریکہ بھی ان کے خلاف کوئی کارروائی

کرے چنانچہ اس خوف سے اسے رہا کر دیا گیا اور وہ بحیرت کیلی فورنیا واپس پہنچ گیا۔

ستمبر ۱۹۲۵ء میں مارشل پیٹن اور مارشل ڈی ریور نے مشترکہ کمان میں سارو سامان کے ساتھ حملہ کیا۔ یہ حملہ اتنا خوفناک تھا کہ تمام عالم انسانیت کانپ اٹھا۔ اس میں فضائی فوج سے بھی مدد لی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ فضائی طاقت امریکہ نے استعمال کی تھی۔ مجاہدین کے ٹھکانوں پر مسلسل بمباری کی گئی۔ جہاں جہاں رلیٹ کے مجاہدین کی موجودگی کا گمان تھا اسے بموں سے اڑا دیا گیا۔ اس کے بعد بری فوجوں نے پیش قدمی کی۔ فرانسیسی اور اسپینی فوجوں کا ملٹی دل اس طرح آگے بڑھ رہا تھا جیسے اسٹیم رولر کسی چیونٹی کو کچلنے کے لیے آگے بڑھ رہا ہو۔ ان فوجوں نے بموں سے تباہ شدہ ٹھکانوں میں حریت پسندوں کو تلاش کیا اور بچے کچھے مجاہدین کو جھنڈ کر قتل کیا۔ ان کے مظالم کی داستان سن کر خود فرانسیسی عوام بھی چیخ اٹھے مگر مجاہدین نے اس کے باوجود شکست تسلیم نہیں کی۔ انھوں نے چپہ چپہ پر بیرونی فوجوں کا مقابلہ کیا۔ رہ دریاؤں میں لڑے، میدانوں میں خبردار زما ہوئے۔ پہاڑوں پر لڑے اور اپنی تمام تر بے سرو سامانی کے باوجود لڑے لیکن ہتھیار نہ ڈالے۔

الغرض سرزمینِ مراکش لاکھوں انسانوں کے خون سے سُرخ ہوتی رہی، گھر ویران ہوتے رہے، ماڈل کی گودیں اُبڑتی رہیں، سُہاگ لٹتے رہے لیکن جنگ کا سلسلہ کسی طرح ختم ہونے میں نہ آیا۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر عبدالکریم کے حساس دل سے برداشت نہ ہو سکا، اس نے جنگ ختم کرنے کی ٹھان لی

اور اس مقصد کے لیے اپریل ۱۹۶۱ء میں اُس نے اپنا ایک خاص ایلچی فرانسیسی حکام کے پاس بھیجا اور جنگ بندی کی بات چیت پر رضامندی ظاہر کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس ایلچی کی تیزی کا یہ عالم تھا کہ ۳ سال کی عمر ہونے کے باوجود اُس نے ۷ میل کا فاصلہ دن بھر میں طے کر لیا۔ فرانسیسی فوجی حکام نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا اور جنگ جاری رکھی۔ مجبور ہو کر اس جیسے اور صر فردش مجاہد نے طے کیا کہ وہ خود ہی فرانسیسی حکام سے مل کر بات چیت کرے گا۔

چنانچہ ایک دن وہ عربی گھوڑے پر سوار ہو کر نہایت تسکنت اور دمار کے ساتھ فرانسیسی حدود میں داخل ہو گیا۔ فوجیوں نے جب اُس کو آتے دیکھا تو مارے خوف کے حواس باختہ ہو گئے۔ فوجی افسران نے اُسے بڑھ کر اس مرد مومن کا استقبال کیا اور حراست میں لے لیا۔ یہاں سے اُسے بحر ہند کے جزائر ری یونین بھیج دیا گیا مگر اس کے ساتھ بھائی اور بیوی بچوں کو بھی جانے کی اجازت دے دی گئی۔ دوسری جنگ عظیم تک وہ اسی جزیرہ میں رہے۔ اس کے بعد انھیں قاہرہ جانے کی اجازت مل گئی۔ ۱۹۶۳ء میں اس مرد مجاہد نے بعمراہ سال داغی اجل کو لبیک کہا۔



**Muhammad Ibn 'Abd al-Karim al-Khattabi.**  
Born: 1882-3, Ajdir -  
Died: February 6,  
1963, Cairo

## ۸۔ خون بہاراں

۱۹۳۷ء میں جب میں اسپین آیا تو میری نیت تھی کہ اخبار کے لیے آرٹیکل لکھا کروں گا لیکن قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ وہاں خانہ جنگی چھڑ گئی، تمام اسپین خون سے لالہ زار بن گیا۔ اور اس میں کتنی ہی قوموں کا خون شامل ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہی خانہ جنگی آگے چل کر دوسری جنگ عظیم میں تبدیل ہو گئی۔ اس افزاتری کے عالم میں مجھے بھی فوج میں شامل ہونا پڑا۔ پھر جو کچھ مجھ پر گزری وہ ایک طویل اور دل ہلا دینے والی داستان ہے۔

مارچ کے مہینے میں انگلینڈ کی طرح یہاں بھی گلابی سر دیاں تھیں۔ ٹھنڈی ہوائیں جسم میں کپکپی پیدا کر رہی تھیں۔ میری خندان سے تھوڑے ناصطے پر ایک ندی بہہ رہی تھی۔ اس کا پانی نہایت شفاف تھا جو نہایت تیزی کے ساتھ پہاڑی سے نکل رہا تھا۔ مجھے غسل کیے ہوئے تقریباً ڈیڑھ ماہ کا عرصہ ہو چکا تھا جی چاہا کہ اس ندی میں نہاؤں لیکن پانی اتنا ٹھنڈا تھا کہ نقطہ انجماد سے شاید ہی کچھ اوپر ہو۔ آخر کچھ دیر بچکچکانے کے بعد میں ایک مرتبہ دانت بیخ کر پانی میں کود ہی تو پڑا لیکن ایک غوطہ لگاتے ہی نکل آیا۔

درس اٹنا کوئی خوفناک مُقابلہ نہ ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ ناشیوں کی طرف سے کوئی باقاعدہ محاذ تو قائم نہ تھا اس لیے مُقابلے کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ البتہ بے نشانہ گولیاں کبھی کبھی آجاتی تھیں جن کے لگنے کا خطرہ تھا میرے ایک ساتھی کو ایسی ہی ایک گولی نے زخمی کر دیا تھا جس کی وجہ سے اس کا بایاں بازو بے کار ہو گیا تھا۔ ناشیوں کا زیادہ تر زور ہمارے ہیڈ کوارٹر لاگرا نچہ پر تھا جو چند سو گز کے فاصلے پر ایک مکان میں قائم تھا۔ یہیں سے ہمیں ساز و سامان اور غذا فراہم ہوتی تھی۔

بہر حال ہمیں ناشیوں کی گولہ باری کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکی حالانکہ وہ ۱۵۰ ملی میٹر کے گولے پھینک رہے تھے لیکن ان میں سے اکثر تو پھٹتے ہی نہ تھے اور جو پھٹتے بھی تھے وہ زیادہ دُور تک اثر نہ ڈال سکتے تھے۔ ایک دن کچھ لوگوں نے یہ ہوائی چھوڑی کہ ناشیوں کی اسلحہ ساز فیکٹری کو سبوتاژ کیا جا رہا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ گولے بڑے پرانے تھے۔ بعضوں کی پیتل کی ٹپریں پر ۱۹۱۷ء کا کندہ ملا تھا چونکہ ہماری توپیں بھی ناشیوں ہی کی طرح کی تھیں اس لیے ہم اکثر ان کے گولے اٹھا کر دوبارہ چلاتے تھے اور دوبارہ بھی وہ پھٹتے نہ تھے، بس آتے ہی جاتے رہتے تھے۔

ہمارا قاعدہ تھا کہ رات کے وقت کچھ مجبوروں کو غیر جانبدار علاقوں میں خبریں لانے کے لیے بھیج دیتے۔ کیونکہ لگل اور موٹر کے ہارن کی آوازوں سے ہی دشمن کی سرگرمیوں کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا کہ کسی کچّا

جھونپڑی یا کٹھڑی میں مالِ غنیمت بھی ہاتھ آ جاتا تھا۔ مثلاً پانی کی بوتل یا کٹھڑی وغیرہ۔ یہ علاقہ بڑا سرسبز و شاداب تھا، مختلف پھلوں اور ترکاریوں کے باغات میدانوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ ہمارے آدمی دن کے وقت بھی چاروں ہاتھ پیروں پر گھوڑے کی طرح چل کر ان باغات میں پہنچ جاتے اور پھل وغیرہ لے آتے تھے۔ جب کبھی کوئی ایک بوری آٹو لے آتا تو اسے ہیڈ کوارٹر سے اس کے بدلے ایک بوتل کافی مل جاتی۔ غرض اب تک کوئی خاص واقعہ رونما نہ ہوا تھا۔ نہ ہم نے کسی پر حملہ کیا اور نہ ہم پر کوئی حملہ کیا گیا۔ عرصہ تک غسل کرنے کی وجہ سے جسم میں جوئیں بھی پڑ گئی تھیں۔ مجھے جوڑوں سے بڑی نفرت ہے۔ دوسرے کپڑے کھوڑے مثلاً پھیر وغیرہ تو اپنا کام کر کے روانہ ہو جاتے ہیں لیکن یہ گنہ گشت جسم پر ہی جمی رہتی ہیں، ان سے مکمل چھٹکارا حاصل کرنے کی کوئی ترکیب نہیں، یہ پا جا مے کی رومالی میں انڈے دیتی ہیں، پھر وہیں انھیں سینے لگتی ہیں۔ اس طرح ان کا خاندان بڑھتا رہتا ہے۔ میرے خیال میں جنگ کے دوران میں ہر سپاہی کے جوئیں پڑ جاتی ہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہمارے پاس ہر چیز کی کمی تھی۔ بوٹ پھٹ چکے تھے اور بعض پٹ سن کی چپل پر گزرا کر رہے تھے جسم کے کپڑے پھینک دیتے ہوئے تھے، نہ تبا کو تھا نہ صابن اور دیگر ضروری سامان کا تو ذکر ہی کیا۔

یہاں تک کہ مارچ کا مہینہ ختم پر آ گیا۔ اتفاق سے ایک دن میرے

ہاتھ میں چوٹ اگنی جس کی مرہم ٹپی کے لیے مجھے مون فلور انٹ اسپتال بھیج دیا گیا۔ یہ ایک چھوٹا سے نام کا اسپتال تھا۔ یہاں کے ملے والے بڑے چور نکلے۔ انہوں نے میری تمام قیمتی چیزیں غائب کر دیں، گھڑی، کیمرہ اور تصویریں سبھی کچھ چرائیا۔ ماما کہ غریب چوری کو دعوت دیتی ہے لیکن ایسا بھی کیا کہ اسپتال والے ایک ایک چیز غائب کر دیں خیر جیسے تیسے کر کے دس دن کاٹے، اس کے بعد چلنے پھرنے اور اسپتال سے باہر جانے کی اجازت مل گئی مگر اب گلے میں جو رومال پڑا رہتا تھا اور جس میں ہاتھ رکھا رہتا تھا وہ بھی غائب تھا۔ مون فلور انٹ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، مٹی کے مکانات، کادوتا نظر آتے تھے۔ کچھ دور دو پختہ مکانات بھی تھے جو غالباً وہاں کے زمینداروں کے تھے۔ ان کے نام طودو نیزو اور طور فابیان تھے۔ باقی علاقوں پر دور دور تک انسانوں کے نشانات تو ملتے تھے لیکن وہ نشانات بیسویں صدی کے انسانوں کے نہ تھے، شاید پتھر کے زمانے کے تھے۔

میرے اسپتال سے واپس آتے ہی کوچ کا حکم مل گیا۔ اب یہیں کوئی ہزار گز چل کر موچہ بنانا تھا وہ جگہ فاشیوں سے لگ بھگ دو سو گز کے فاصلے پر تھی۔ اس ٹھم میں ہم تین دن تین رات سونہ سکے۔ سات گھنٹے تک لہلہ میں بیٹھے رہے جس کی سٹرن دماغ کو پاش پاش کیے دے رہی تھی اور جسم اندر دھنستے جا رہے تھے جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس سے زیادہ سردی مجھے اسپین میں کبھی نہ لگی برہم سے سو گز پیچھے ایک اور جماعت اپنے کام میں مصروف تھی لیکن بڑی خاموشی کے ساتھ۔ آج مجھے اسپین والوں کی زبردست تنظیمی صلاحیتوں کا اندازہ ہوا۔ سات گھنٹوں میں انہوں نے بارہ سو میٹر لمبی خندق بھی کھود لی اور اس کے سامنے ریت کی بوریلوں کی دیوار بھی کھڑی کر لی اور شور ذرا سا بھی نہ ہوا۔ یہ جگہ فاشی حدود سے کوئی ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر تھی۔ دوسرے دن بھی سب نے اپنا اپنا کام نہایت ذمہ داری کے ساتھ انجام دیا۔

صبح ہوتے ہی فاشیوں کو ہماری موجودگی کا علم ہو گیا اور کیسا فرانسکا کے سفید چوڑے سے ہمارے اوپر مشین گنوں سے گولیوں کی بارش شروع ہو گئی۔ انہوں نے تاک تاک کر خندقوں کو نشانہ بنایا۔ ہم ریت کی دیوار کے سارے مزے میں کھڑے رہے۔ تعجب ہے کہ ان لوگوں نے یہیں بکوں نہیں دیکھا جو لوگ خندق کے اندر تھے وہ بھی گولیوں کی زد سے بچے رہے کیونکہ خندق خاصی گہری تھی اور لوگ اسے مزید گہرا کرتے جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں بھی اچھل کر خندق میں کود گیا۔ میرے ہاتھ میں اب بھی پتی بندھی ہوئی تھی اس لیے خندق کی کھدائی سے بچ رہا اور ایک بغلی غار میں گھس کر مزے سے ناول پڑھتا رہا۔ ہمارے ساتھیوں میں سے بعض کے کچھ چوٹیں اٹھیں، لیکن یہ نقصان کوئی قابل ذکر نہیں ہے۔ ہاں اگر فاشی چھوٹی توپوں سے گولہ باری کرتے تو ہم میں سے کوئی نہ بچتا۔ دن بھر کی گولہ باری کے بعد شام ہو گئی اور توپیں خاموش ہو گئیں۔

دوسرے دن ہمیں طور فابیان پر حملہ کرنا تھا لیکن وائریس پر اطلاع ملی کہ اس کو ملٹری کر دیا جائے اور اس کے بجائے دوسری جانب فاشیوں

سے کوئی پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر دفائی لائن بنائی جائے۔ بہر حال ہمارے آدمی ایک خشک نہریں اوندھے لیٹ گئے ان کی رائفلوں کی سنگینیں باہر نکلی ہوئی تھیں اور آنکھوں کی سفیدی رات کی تاریکی میں چمک رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ اتنے میں مغرب کی طرف آفت پر تھوڑے تھوڑے وقفے سے شعلے بھڑکے، پھر ایک زبرد دار دھماکہ ہوا۔ یہ ٹھم ابھی جاری ہی تھی کہ پھر دُرائیں پر اطلاع ملی کہ اس کو ختم کر کے واپس آؤ۔ گولہ باری اور توپوں کی گھن گرج کا یہ سلسلہ کئی روز تک چلتا رہا۔ کبھی کہیں حملہ ہوتا تو کبھی کہیں۔ یہاں تک کہ ہیرو سکا کے ارد گرد تمام علاقوں کو تاخت و تاراج کر دیا گیا۔ جب کبھی نیند کا غلبہ ہوتا تو ہم کسی خندق میں چلے جاتے لیکن جلد ہی کسی گولی کی آواز سے خنجر کراٹھ بیٹھتے۔ اب طوفانیاں ہمارے قبضے میں آچکا تھا اور وہی ہمارا مبلغ تھا۔ ایک دن صبح کے وقت ہم بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ گولیاں آنی شروع ہو گئیں۔ اس دن فاشیوں نے بڑے صحیح نشانے لگائے۔ غالباً جرمن بندوچی آگئے ہوں گے۔ ہمارے مبلغ کے کئی اہم حقے اُن کی گولہ باری سے گر پڑے اس کے باوجود ہم لوگ پنج رہے۔

شب دروڑا سی طرح گزرتے رہے۔ کچھ عرصے کے بعد دُروسی ساخت کی ۷۵ ملی میٹر کی بندوچوں سے بھی گولیاں نکلنے لگیں۔ یہ بندوچیں ہمارے بالکل عقب میں تھیں لیکن نظر نہ آ رہی تھیں۔ مجھے زندگی میں پہلی بار دُروسی بندوچوں سے سابقہ پڑا تھا۔ ان کی گولیاں بہت نیچی جاتی تھیں لیکن رفتار بہت تیز

تھی۔ مون فلور اسٹ کے پیچھے دو بڑی توپیں نصب تھیں جو کبھی کبھی گولہ داغ دیتی تھیں جن کی آواز تیز اور گونج دار نہ تھی۔ کوہ آراگن پر زمانہ وسطی کا ایک قلعہ تھا۔ یہاں سے ہیرو سکا کی حفاظت ہوتی تھی۔ یہاں بھی ایک توپ لگی ہوئی تھی جو انیسویں صدی کی ضرور ہوگی۔ اس کے بڑے بڑے گولے اس قدر آہستہ نکل کر جاتے کہ آپ چاہتے تو اس کے ساتھ دوڑ سکتے تھے۔ اس کی آواز بس یوں سمجھیے جیسے کہ سائیکل پر کوئی آدمی گھنٹی بجاتا جا رہا ہو۔ چھوٹی توپوں کی آواز البتہ بڑی ٹہب تھی۔ ان کے گولے کیا تھے تاہم پتہ نہ تھا، جو برجی کی مانند ہر چیز کو چیرتے چلے جاتے۔ کبھی کبھی ہمارے جہازوں پر ہوائی تار پیڈ چسکے گئے جن کی آواز سے کئی میل تک کا علاقہ دہل گیا۔ پھر فاشیوں نے طیارہ شکن توپیں چلائیں لیکن وہ بھی پھپھسا کر رہ گئیں۔ طیارے ان کے گولوں سے ہزاروں گز دور تھے۔

ادھر ہم لوگ بھی فاشیوں سے بند آزار رہے۔ کبھی کہیں مورچہ ہو گیا تو کبھی کسی طرف حملہ کر دیا۔ ایک مقام پر پیل کے پاس ہمارے آدمی ایک رکاوٹ تعمیر کر رہے تھے کہ فاشیوں نے ان پر چھوٹی توپوں سے حملہ کر دیا۔ دونوں طرف سے گولہ باری ہوئی۔ دھماکوں کی آوازیں آتی رہیں لیکن سگڑ کے فاصلے پر نہیں کھڑا ہوا تا شاد دیکھتا رہا، مجھے کوئی نقصان نہ پہنچا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمین سے آسمان کی طرف دھویں کے درخت کھڑے ہو رہے ہیں جو جادو کے زور پر غائب ہو جاتے ہیں۔ ہمارے آدمیوں نے گولہ باری کا بھی مقابلہ کیا اور آہستہ آہستہ رکاوٹ بھی تعمیر کر لی اس طرح خانہ جنگی کا یہ سلسلہ مدتوں جاری رہا۔ (جارج اور ول)

## ۹۔ چھوٹے جہاز بڑے کارنامے

جنگ کے دوران میں چھوٹے جہاز بھی بڑے جہازوں سے کسی طرح کم اہم نہیں ہوتے۔ دوسری جنگ عظیم کے شروع میں بعض ایسے ہی چھوٹے جہازوں نے ڈنکرک کے مقام سے اسی ہزار برطانوی سپاہیوں کو اتنی چالاکی، پھرتی اور مہارت سے نکالا کہ دنیا کے بڑے بڑے ماہرین جنگ عیش کر گئے۔ لیکن ہے آپ ان جہازوں کے کارناموں کو نظر انداز کر دیں لیکن بحریہ سے تعلق رکھنے والے انہیں منجھڑے سے کم نہیں سمجھتے۔ ذیل میں انہی چھوٹے جہازوں کشتیوں اور لاپٹوں کے بعض کارنامے مختصراً دیے جا رہے ہیں۔ ان کی سب سے زیادہ گہما گہمی اور نقل و حرکت جمعرات ۳۰ مئی ۱۹۴۰ء کو ہوئی۔ اس لیے تاریخ میں اس دن کو ایک یادگار دن قرار دیا گیا ہے۔

موٹر بوٹ، لاپٹ، کشتیوں اور چھوٹے جہازوں کا اتنا بڑا بیڑا انگلینڈ کے ساحل پر اس سے قبل کسی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تنکے لکھے ہوئے جہاز جو تمام انسانیت کو کھینچ لانے والے ہوں۔ آخر ان جہازوں کا بیڑہ ڈنکرک کی طرف روانہ ہوا۔ ساحلوں پر جہاز رانی انتہائی مخدوش تھی۔ تباہ شدہ جہازوں کے بلے، الٹی ہوئی کشتیاں، پھیلے ہوئے تار، بیڑے اور ہاتھ پاؤں

مارتے ہوئے سپاہیوں کی بہتات نے جہازوں کا چلنا اور بھی مشکل بنا دیا تھا۔ ہر طرف سے آدازیں آرہی تھیں بچاؤ بچاؤ، شام راکت جہاز پر شکل ساٹھ آدمیوں کی گنجائش تھی لیکن اسی اسی آدمی سوار ہو گئے۔ ان کی حالت تباہ تھی۔ بھوکے پیاسے سپاہی، جن کے بدن پر صرف ایک پتلون تھی، پناہ ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ دوڑ دوڑ کر شام راکت پر سوار ہو گئے۔ ان کو بہت پھرتی کے ساتھ بڑے تباہ کن جہاز پر چھوڑنا تھا جو گہرے سمندوں میں کھڑے تھے۔ اس کام میں مدد کے لیے کوئی رضا کار بھی نہ ملتا تھا جو کچھ اور سپاہیوں کو لائف بوٹ کی مدد سے ساحل سے اٹھالائے۔ آخر کار یہ کام ایک جیالے سپاہی براؤن نے اپنے ذمہ لیا لیکن جو نہی شام راکت چلنے کے لیے تیار ہوا، اس کے پکھے فیل ہو گئے اور انجن بند ہو گیا۔ فوراً ہی دوسرے جہاز کینوسے کوئین نے رستی باندھ کر شام راکت کو کھینچا اور بڑے تباہ کن جہاز تک پہنچایا۔ خیریت ہوئی کہ سب آدمی صحیح سلامت اتر گئے۔ اس کے بعد اس جہاز کی مرمت کی کوشش کی گئی۔ بحریہ کے انجنیئروں نے بہت سر مارا لیکن بے سود۔ مجبوراً بیرل اور براؤن بھی تباہ کن جہاز پر سوار ہو گئے۔ بیرل نے ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لیے اور دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگا۔

ایک دوسرا چھوٹا جہاز لونی ہیدز تھا جو لیفٹننٹ سی ڈبلورڈ کی قیادت میں روانہ ہوا۔ اس کے ساتھ دس لائف بوٹوں کا بیڑہ تھا۔ راستے میں ایک موٹر بوٹ خراب ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ چلتے وقت جلدی میں

دوسرے دن صبح پانچ بجے کے قریب یہ جہاز روانہ ہوئے۔ تھوڑی بعد دُھند بڑھنے لگی۔ چنانچہ انجن کو بند کر کے دُھند چھٹنے کا انتظار کرنا پڑا اور باقاعدہ روانگی کوئی ساڑھے چھ بجے ہو سکی۔ سب سے آگے "ماجوی" تھا، اس کے پیچھے "وین گارڈ" اور سب کے پیچھے سی سالٹر۔

سمندر کی لہریں پرسکون تھیں۔ مدوجزر مغرب کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دو گھنٹے کے سفر کے بعد پھر دُھند بڑھنے لگی کسی کے پاس نہ تو نقشے تھے اور نہ مفاطیسی سوئیاں ہی قابل اعتبار تھیں۔ کانوں میں بند وقوں کی آوازیں اور طیاروں کی گھر گھر اہٹ سنائی دے رہی تھی لیکن نظر کچھ نہ آ رہا تھا۔ کوئی چھ بجے شام کے قریب ڈنکرک کا لائٹ ہاؤس نظر آیا۔ ہوائی جہازوں کی آوازیں اب بھی آرہی تھیں۔ جب کمر کچھ کم ہوا تو جہاز نظر آئے۔ انھوں نے طیارہ ٹیکن توپوں کے دہانے کھول دیے اور ہوائی جہاز غوطہ لگا لگا کر ان چھوٹے چھوٹے بحری جہازوں پر گولہ باری کرنے لگے لیکن ان کے نشانے خطا ہو رہے تھے۔ آہستہ آہستہ یہ جہاز ساحل کی طرف بڑھے اور پونے سات بجے کے قریب بندرگاہ کے اگلے حصے تک پہنچ گئے۔ یہاں پہنچ کر ان چھوٹے جہازوں کے عملے نے چاروں طرف نظر دوڑائی تو انھیں کوئی آدمی نظر آیا اور نہ کوئی لائف بوٹ دکھائی دی، ہر طرف سناٹا ہی سناٹا تھا۔ اُن کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی اور جب یہ لوگ اپنے تباہ کن جہاز کے قریب پہنچے تو اُن سے پوچھ گچھ کی مگر انھوں نے بھی کوئی واضح جواب نہ دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کچھ سپاہی لکڑی کے ٹکڑوں میں چپکے تیرتے نظر آئے اور ایک ایک

اس کے فلٹر اور کاربوریٹر نہیں دیکھے گئے تھے۔ کاربوریٹر میں کچرا پھنس گیا جس کی وجہ سے وہ بند ہو گیا۔ "بونی ہید" رجب بحفاظت ڈنکرک پہنچا تو اس کو ریمس گیٹ اور ڈنکرک کے درمیان سات چکر لگانے پڑے اور ہر مرتبہ ساٹھ آدمیوں کو پہنچانا پڑا۔

۲۱۔ مئی کی صبح کو جب "سدرن کونین" اور "فیری ٹائمٹ" دوڑ بھاگ میں مصروف تھے انھیں ڈوور جانے کا حکم ملا اور وہ دوسرے دن ڈوور پہنچ گئے۔ یہ جہاز پرائیویٹ تھے لیکن ڈوور پہنچ کر انھیں بحریہ نے اپنے قبضے میں لے لیا اور سہ ہفتہ تک انھیں اپنے مشن پر بھیج دیا گیا۔ اس میں سے "فیری ٹائمٹ" نے اپنا کام مکمل کر لیا اور کچھ عرصہ کے بعد اس کی مرمت کر کے مالک کو واپس کر دیا گیا لیکن "سدرن کونین" بد قسمت نکلا۔ اس پر ایک بم ایسا پڑا کہ جہاز کے پرچے اڑ گئے اور وہ سمندر میں بیٹھ گیا۔ اسی طرح دو جہاز چھپروں کے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام "وین گارڈ"

اور دوسرے کا "سی سالٹر" تھا جو نہی ان کے مالکوں کو خبر ملی کہ ڈنکرک سے سپاہیوں کو نکلانے کے لیے ہمارے جہازوں کی اشد ضرورت ہے۔ وہ فوراً ہی پہنچ گئے۔ ان کے علاوہ ایک اور جہاز "ماجوی" بھی ساتھ ہو گیا۔ انھیں صبح پانچ بجے وانگی کا حکم ملا۔ شام ہی سے تیاریاں شروع ہو گئیں اور مختلف قسم کا سامان، پانی اور پیٹرول وغیرہ لے لیا گیا۔ اس کے ساتھ کوئی لائف بوٹ نہ تھی اس پر ایک چھوٹی پرام ڈنگی اس کے ساتھ کر دی گئی۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ اس پر باری باری دو سپاہی بھی سوتے رہے۔



یہ ایک بہت بڑا خطرہ مول لیا گیا تھا کیونکہ دین گارڈ میں بھلا اتنی سکت کہاں تھی مگر کسی کو روکا بھی نہ جاسکتا تھا جہاز کے عملے والوں نے ان زخمی اور پریشان حال سپاہیوں کو چائے، بسکٹ اور دیگر سامان پیش کیا اور دین گارڈ پر ہی یہ لوگ رمیس گیٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ بموں اور گولیوں کی بارش ہو رہی تھی اور جہاز اپنی منزل کی طرف گامزن تھا۔ کوئی ایک گھنٹے کے سفر کے بعد یہ لوگ خطرے سے باہر نکلے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ ایک گھنٹہ کیونکر گزرا۔ دوسرے دن صبح ساڑھے آٹھ بجے یہ لوگ ”رمیس گیٹ“ میں داخل ہو گئے۔ سپاہی خوش و خرم ساحل پر اترے اور اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔

ایک اور جہاز ٹگرس، جو کنگسٹن سے آیا ہوا تھا، اپنے مالک کے حکم پر بچاؤ کی اس مہم میں ڈنکرک روانہ ہوا۔ وہاں پہنچ کر اندازہ ہوا کہ پھنسے ہوئے سپاہیوں کو نکالنا بہت مشکل ہے چنانچہ ایک دوسرے جہاز لانس ڈاؤن کو اس مقصد کے لیے ساحل پر بھیجا گیا جس کو ۹ میل دور ساحل کے ساتھ ساتھ لاپسے جانا پڑا، وہاں بھی کچھ سپاہی تھے۔ وہ ان سپاہیوں کو لے کر دوبارہ ڈنکرک پہنچا۔ اب ٹگرس بھی آدمیوں کو نکلنے کے قابل ہو گیا تھا کیونکہ جوار بھاٹا بڑھ چکا تھا۔ اس مہم کے دوران میں ان پر بمباری بھی ہوتی رہی اور مشین گنوں سے گولیوں کی بوچھاڑ بھی۔ بہر حال انھوں نے سپاہیوں کو لے جا کر تباہ کن جہازوں پر پہنچا دیا۔ چوتھے چکر میں ایک بم ایسا آن کر لگا کہ یہ جہاز تباہ ہو گیا اور ڈوبنے لگا۔ جہاز کا کیپٹن کسی

کر کے قریب آنے لگے۔ پھر ایک کشتی پر کچھ سپاہی لدے ہوئے دکھائی دیے۔ سب لوگ دوڑ دوڑ کر انہیں اپنے جہازوں پر لے جانے لگے اور ان جہازوں سے بڑے تباہ کن جہازوں پر منتقل کرنے لگے۔ بد قسمتی سے اسی دوران ”بھول“ جہاز کا ہتوار ٹوٹ گیا اور اس کے پچھلے بند ہو گئے چنانچہ اس کا عملہ دوسرے جہازوں پر آ گیا۔ کافی دیر تک لوگوں کو بچانے کا کام پورے جوش و خروش سے ہوتا رہا۔ جہازوں کے عملے اور رضا کاروں کا خیال تھا کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں۔ وہ بہادری نہیں ہے بلکہ ایک عزم کا اظہار ہے کہ انسانوں کو جہنم سے نکال لینے میں اگر وہ کسی کام آسکتے ہوں تو ان کی خوش قسمتی ہوگی۔

اس مہم کے دوران اتنا زبردست شہد و غل تھا کہ کان پری آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ ایک طرف طیاروں کی گھڑ گھڑاہٹ، دوسری طرف طیارہ شکن توپوں کی گھن گرج اور اس پر مستزاد پانی کے تیز فوارے سمندر سے آسمان کی طرف بلند ہو رہے تھے۔ جہازی ماحول سے بے خبر اپنی دھن میں لگے ہوئے تھے۔ آدمیوں کو اٹھانا اور بڑے جہازوں تک پہنچانا ان کا کام تھا۔ دس بجے تک مکمل اندھیرا چھا گیا۔ بڑے جہازوں نے شکر اٹھالیے اور روانہ ہو گئے۔

تینوں جہاز بلکہ دونوں چھوٹے جہاز بھی اب تک اپنے کام میں مصروف تھے اور سپاہیوں کو اٹھا اٹھا کر لارہے تھے لیکن اب کوئی بڑا جہاز ان کے جانے والا نہ تھا۔ یہ لوگ بڑے پریشان ہوئے کہ ان کو کیونکر پہنچایا جائے۔ آخر گیارہ بجے رات نوے آدمی دین گارڈ پر سوار ہوئے۔

گئی تھی۔ چار بجے شام کو یہ رسی ٹوٹ گئی اور پوہنا کا عملہ چاروں غلے پخت کر گیا۔ چار بج کر چاس منٹ پر دوسری رسی باندھی گئی اور جہاز دوبارہ چلا۔ آخر یہ لوگ تجھپٹے کے وقت ڈنکرک جا پہنچے پھر مشرق کی طرف کچھ دور گئے تاکہ ساحل پر کھڑے ہوئے لوگوں سے ملاقات ہو جائے اور انھیں اس پر بٹھایا جائے۔

اس وقت خاصا کٹر چیلہ ہوا تھا اور اندھیرا بھی ہو چلا تھا۔ پھر بھی چیزیں نظر آ رہی تھیں۔ یہ جہاز جس جگہ پہنچا تھا وہاں اس سے پہلے کوئی اور نہ پہنچا تھا لہذا کافی دیر تک وہاں کوئی آدمی نظر نہ آیا اور یہ لوگ کچھ خوف سا محسوس کرنے لگے تھے۔ اچانک کچھ فرانسیسی نظر آئے۔ جہاز نے ان کو بڑے جہاز تک پہنچایا اور کئی چکر لگائے۔ اس کام میں دونوں کشتیوں سے بھی مدد لی گئی وہ وہیلر اور کٹر کو ساحل کے نزدیک لے جاتے۔ کٹر اپنا لنگر پانی میں ڈالتا اور خشکی سے بالکل قریب ہو جاتا۔ سپاہی آ آ کر بیٹھتے۔ اس کے بعد لنگر اٹھایا جاتا۔ سپاہیوں کو موٹر بوٹ میں پہنچایا جاتا پھر واپسی ہو جاتی۔ وہیلر اور کٹر جتنی دیر اپنے کام میں مصروف رہے کانسٹیٹ نامف جہاز پر وہ دبیا رہا۔ کیونکہ اگر ان میں سے کسی ایک کو نقصان پہنچتا تو سپاہیوں کا انخلا ناممکن ہو جاتا۔

پہرے کے دوران میں اس چھوٹے جہاز نے ایک کام یہ بھی کیا کہ کوئی تیرتا ہوا سپاہی نظر آتا تو اسے اُپر اٹھا لیتا یا کوئی ٹوٹی پھوٹی کشتی یا موٹر بوٹ وغیرہ ملتی تو اسے بھی اٹھا کر رکھ لیتا۔ اس طرح کئی چکر میں تمام فرانسیسی

صورت بڑے جہاز تک پہنچ گیا اور اسی پر آٹھ سو سپاہیوں کے ساتھ ریس گیٹ واپس پہنچ گیا۔ اسی طرح ایک چھوٹا جہاز کانسٹیٹ نامف بھی اس مہم میں شریک ہوا۔ یہ جہاز بھی پراہیویٹ تھا لیکن ہنگامی حالت میں بحریہ نے اسے اپنے استعمال میں لے لیا تھا۔ اس جہاز کے کیپٹن سے کہا گیا تھا کہ یہ مہم ایک ماہ جاری رہے گی۔ اس پر وہ بہت خوش ہوا کیونکہ مہم جوئی اس کی سرشت میں شامل تھی لیکن اس کو موجودہ مہم کے خطرات سے ذرا بھی غفایت نہ تھی۔ کیپٹن نے مہم پر روانہ ہونے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ دوستوں سے ملا۔ کچھ دوسرے متعلق لوگوں سے ملاقاتیں کیں اور چھ بجے شام کو روانہ ہونے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس کے ہمراہ جہاز کے عملے میں دو نوجوان شامل تھے، سامان میں پورا پٹرول، اس کے علاوہ ڈرم میں زائد پٹرول، پانی کی بوتلیں، کچا گائے کا گوشت اور دو بوری آلو۔ اس طرح جہاز پر کافی وزن ہو گیا۔ چونکہ ایک طرف کا فاصلہ ۱۵۰ میل تھا اس لیے اس فاصلے کے لیے جانے آنے اور سپاہیوں کو بچانے کے لیے بھاگ دوڑ کرنے میں بھی کافی پٹرول خرچ ہوتا۔ اس جہاز سے اتنا طویل سفر اور وہ بھی صرف پندرہ آدمیوں کو بچانے کے لیے مناسب نہ تھا۔ اس لیے طے پایا کہ یہ لوگ دو کشتیاں بحریہ سے لے جائیں تاکہ یہ کشتیاں انسانوں کے دھڑے دھڑپانے کے کام آئیں۔ یہ جہاز سوئی کو ساڑھے تو بجے روانہ ہوا۔ اسے اور دوسری کشتیوں کو بحیم کے بنے ہوئے پوہنا تہاز سے منسلک کر دیا گیا اور اس میں لوہے کی رسی باندھی

کوئی ساڑھے چار سو چھوٹے جہاز آئے تھے۔ ان سب نے بڑی خوش اسلوبی سے اپنا کام انجام دیا۔ ان میں سے بعضوں کے وزن ۲۳ ٹن تک تھے۔ ایک تو اتنا چھوٹا تھا کہ وہ چند آدمیوں کے بڑھ جانے سے ڈوب گیا۔ قصہ مختصر یہ کہ ان چھوٹے چھوٹے جہازوں، کشتیوں اور لائینوں نے فوجوں کے انخلا کے سلسلے میں وہ کارنامے انجام دیے جو بحریہ کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہیں گے۔ یہ کارنامے دراصل چھوٹے جہازوں کے نہ تھے بلکہ ان کے عملے کے تھے۔ عملے والوں نے زبردست بسادگی، تیزی اور بلند حوصلگی سے سپاہیوں کو نکالنے کی جدوجہد کی اور خدا نے انہیں کامیابی عطا کی۔

سپاہی اور ایک برطانوی افسر کو جہاز تک پہنچایا گیا۔ اس کے بعد خبر ملی کہ ڈنکرک شہر کے نزدیک برطانوی فوج کی پوری ڈویژن جانے کے لیے تیار کھڑی ہے۔ جس جگہ وہ سپاہی کھڑے تھے وہاں انہوں نے پہچان کے لیے آگ جلا رکھی تھی۔ یہ جہاز مع دیگر ساز و سامان اور وہیلز اور کٹر کے اُسی آگ کی روشنی کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر دیکھا تو ان میں بھی فرانسیسی اور انگریزی سپاہیوں کی بہت بڑی جمیعت تھی۔ تھوڑا تھوڑا کر کے سب کو بڑے جہاز تک پہنچایا گیا۔ اسی اثنا میں جرمن بمباری طیاروں نے آگ پر بم گرا کر اس کو موم بتی کی طرح بجھا دیا لیکن اس سے کوئی خاص نقصان نہ پہنچا کیونکہ جہاز والے راستہ پہچان چکے تھے۔ اس کے علاوہ سپاہیوں کی اتنی بڑی تعداد ساحل پر کھڑی تھی کہ ان کو دور سے شناخت کر لینا کچھ زیادہ مشکل کام نہ تھا۔ تین بجے صبح تک تباہ کن جہاز سپاہیوں سے پوری طرح بھر گیا اور اسی وقت چل پڑا۔ یہ خطرہ اب بھی موجود تھا کہ دشمن کا کوئی بم تباہ کن جہاز ہی کو تباہ نہ کر دے۔ لیکن دشمن اپنے اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ یہ جہاز اپنی آغوش میں ملاح، پھیرے، سپاہی، ڈاکٹر اور عام انسانوں کا جم غفیر لیے منزل کی طرف رواں ہو گیا۔

پچھیروں کا ایک اور جہاز "لائڈمی سوزین" بلجیم سے سپاہیوں کو نکالنے کے لیے آیا ہوا تھا۔ یہ جب سپاہیوں کو لے کر چلا تو اس میں برطانوی اور فرانسیسی سپاہیوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ اس پر دشمن نے حملہ کر دیا اور سپاہیوں کے علاوہ ایک افسر بھی بڑی طرح زخمی ہو گیا۔ بلجیم سے

جب طیارہ کچھ نزدیک آیا تو اُس نے سچان لیا کہ یہ جرمن جہاز (HEINKEL) ہینکل ہے۔ جان کی ایک ہی گولی سے جہاز کے پرچے اڑ گئے اور وہ بڑپوٹ کے ساحل کے نزدیک شعلوں کی نذر ہو گیا۔ اس واقعہ کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ کچھ عرصہ بعد ایک اکبرے انجن والے رٹاکا طیارے کے پائلٹ نے دعویٰ کیا کہ اس جہاز کو میں نے تباہ کیا ہے۔ اُس نے کہا کہ اس جہاز میں فضا میں آگ لگ گئی تھی جب وہ نیچے آیا تو میں نے گولی چلا لی۔ جان نے جب یہ من گھڑت کہانی سنی تو اُسے ذرا بھی افسوس نہ ہوا بلکہ اُس نے بڑا لطف لیا۔

اُس کا قاعدہ تھا کہ ہر معرکہ کا صحیح وقت اور مقام ضرور نوٹ کر لیتا اور کنٹرول کو اس سے باخبر رکھتا تھا۔ اسی لیے اس کے دعووں پر کبھی کسی نے شک کا اظہار نہیں کیا۔ خیر تو جب دشمن کے جہاز کو تباہ کر کے یہ لوگ واپس آرہے تھے تو انھیں کسی دوسرے جہاز کی پرواز کا شک گزرا۔ ابھی یہ لوگ برشل کے مضافات ہی میں تھے کہ رانسے نے اُس شیشے پر سے نظریں اٹھائیں جس کا تعلق رڈار سے تھا اور کھڑکی سے باہر دیکھا۔ نیچے بندوق کی گولیوں کے شعلوں سے اتنی روشنی پھیلی ہوئی تھی جیسے کہ لاؤجل رہے ہوں۔ ان لوگوں نے وہاں سے نکل بھاگنا مناسب سمجھا لیکن دشمن کے طیارے نے انھیں بھاگنے کی ہمت ہی نہ دی۔ صرف چار سو گز کے فاصلے پر جرمن طیارہ ہینکل نظر آنے لگا۔ چند لمحوں میں گولیاں اُن کی طرف آنے لگیں اور کسی لمحے ان کے جہاز کی تباہی کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ اچانک دھوئیں کا ایک گولا پھٹا اور دھوئیں

## ۱۰۔ تساروں کے آگے...

یہ داستان ایک ایسے ہوا باز کی ہے جسے دوسری جنگ عظیم کاب سے بڑا ناٹ ناسٹر پائلٹ تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کا نام جان کنگھم ہے۔ دنیا بھر کی فضائی افواج اُسے آج بھی عزت و احترام کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ اس کا ایک ساتھی ہوا باز بھی تھا جس کا نام سی۔ ایف۔ رانسے تھا۔ دونوں نے بل کر جرمن طیاروں کے خلاف ایسے ایسے معرکے سر کیے کہ اُن کے کارنامے طلسمی افسانوں کا روپ اختیار کر گئے ہیں۔

۱۹۴۱ء کا موسم بہار تھا۔ جنگ پورے شباب پر تھی جرمن طیاروں کی جارحانہ قوت کافی کم ہو چکی تھی تاہم رات کے وقت اُن کے حملے برابر جاری تھے۔ جان اور رانسے دونوں ہر وقت رڈار کے پاس موجود رہتے جو نئی انھیں دشمن کے کسی جہاز کے آنے کی اطلاع ملتی، تو وہ پلک جھپکتے میں فضاؤں میں پہنچ جاتے اور ایسا کبھی نہ ہوتا کہ انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ ان کا رابطہ ہر وقت دو رڈار سیشنوں سے رہتا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ رات کے وقت جان کو اطلاع ملی کہ ایک جہاز برشل کی طرف آ رہا ہے۔ یہ فوراً ہی اپنے طیارے پر فضا میں پہنچ گیا۔

کی زبردست دیوار دونوں جہازوں کے درمیان حائل ہو گئی۔ ہیکل نے فوراً ہی غوطہ لگایا اور خود کو محفوظ مقام پر پہنچا دیا۔ اچانک دوسرا گولا پھٹا اور ہر طرف دھواں پھیل گیا اور اسی کے ساتھ ہی جان اپنے جہاز کی بلندی کا احساس کھو بیٹھا۔ اور نشانہ بھی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ رانسے اس دوران برابر کیلئے تھوڑے ٹیوب دیکھتا رہا۔ دشمن کا جہاز برابر دور ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے یہ بات جان کو بتائی۔ جان نے کہا کوئی بات نہیں، میں حملہ کروں گا میں صورت حال کو زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔ لیکن دشمن کا جہاز ہاتھ نہ لگا اور دونوں کی سسی ناکام ہو گئی۔

اس وقت ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ دشمن کے جہاز کو اچھی طرح شناخت کر لیا جائے کیونکہ فضائی جنگ میں اکثر مغالطہ ہو جاتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ ہوا باز خود اپنے ہی جہازوں کو بغیر شناخت کیے مار گرتے ہیں۔ اس لیے ہوا باز اور فائٹرز اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ دشمن کے جہاز کو اپنی آنکھ سے دیکھ کر پہچان لیں۔ اگر مطلع صاف ہو اور ہوا باز کے پاس وقت ہو تو شناخت اتنی مشکل نہیں ہوتی لیکن اس کے برخلاف اگر فضا میں بیک وقت کئی ایک طیارے بھیج دیے گئے اور سب کا مشن ایک ہے تو پھر سب ہی پھرتی دکھاتے ہیں نتیجہ غلطی ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی اپنا ہی جہاز نشانہ بن جاتا ہے۔

ایک مرتبہ ایک نوجوان پائلٹ اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ ایک جہاز مارا کہ وہ ایس آیا امدانے کے بعد غصیہ افسر کو مبارکباد دی کہ بتائی ہوئی نشانی پر میں نے

دشمن کا جہاز مارا گیا۔ لیکن جب ملکہ کا معاہدہ ہوا تو معاملہ کچھ اور سی تھا۔ یعنی تھا تو دشمن کا ہی جہاز لیکن یہ ہیکل سوم نہ تھا بلکہ ۸۸ تھا۔

جان نے کبھی اس قسم کی غلطی نہیں کی۔ ایک رات وہ بڑا مصروف تھا۔ اس نے ایک ہیکل سوم مارا گیا۔ اس کے بعد دوسرے طیارے کو نقصان پہنچایا اور اب وہ ہیٹ ٹرک کے چکر میں تھا یعنی تیسرے جہاز پر بھی ہاتھ صاف کرنا چاہتا تھا چنانچہ اس مقصد کے تحت اس نے تمام ریڈیائی سلسلے منقطع کر دیے تاکہ کنٹرول سے بار بار اس کے ذہن کو منتشر نہ کیا جائے۔ چند لمحوں میں رانسے نے خبر دی کہ ایک جہاز بالکل مخالف سمت میں آرہا ہے۔ جان نے دریافت کیا تھا راکیا خیال ہے، یہ کون سا جہاز ہو سکتا ہے؟ رانسے نے چاروں طرف نظر دوڑائی پھر جہاز کو دیکھا تو اس کو ایسا لگا جیسے یہ ہیکل نہیں ہے۔ اس نے سوچا کہ اگر ہیکل نہیں ہے تو پھر نیکر ہوگا۔ لیکن یہ تو بہت بڑا ہے اور اگلا حصہ بہت چھوٹا ہے۔ کافی دیر تک غور و خوض کرنے کے بعد اس نے کہا:-

”میرے خیال میں یہ بیوناسٹر ہے۔“

”ہاں، جان نے جواب دیا میرا بھی یہی خیال ہے۔ آؤ کنٹرول سے رابطہ قائم کریں۔ یہ کہہ کر جان نے ریڈیو کا سوئچ کھولا اور کنٹرول سے بات کی۔

”کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ دشمن کا جہاز ہے؟“

”نہیں نہیں“ کنٹرول نے چخ کر کہا: ”وہ دس منٹ سے خوشامدیں کر رہا

ہے کہ خدا راجھے بچاؤ میں زرخے میں پھنس گیا ہوں لیکن تم سے رابطہ ہی قائم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ جہاز اپنا ہی ہے اور ٹرسکس ہے ٹرسکس اس جہاز کا خفیہ نمبر تھا۔ چند لمحوں بعد وہ جہاز جان کے جہاز کے قریب پہنچا۔ جان نے زور سے کہا ٹھینک بڑ، ٹرسکس۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور یہ لوگ جہاز اُتار لائے۔

ایک رات چودھویں کا چاند آسمان پر جگمگا رہا تھا اور چاندی زمین پر بکھر رہی تھی۔ دونوں ہوا باز اپنی مہم میں مصروف تھے کہ انھیں ایک جہاز کی خبر ملی جو ان کے اوپر کافی بلندی پر پرواز کر رہا تھا اور دونوں جہازوں کے درمیان میں بادلوں کی ایک گہری تہہ حائل تھی جان نے اپنے جہاز کو بھی اوپر چڑھانا شروع کر دیا اور رفتار بھی بڑھادی۔ دیریں انارنج ایک ہزار فیٹ ہو گئی۔ اب اس کا جہاز بادلوں کے اندر تھا۔

جان نے کہا مجھے تو یقین نہیں آتا کہ دشمن کا ہوا باز جان بوجھ کر ان بادلوں میں اُڑان کر رہے ہیں نیچے جا کر پھر تھوڑا اوپر اُڑوں گا۔ رڈار اسکرین سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اب مقابلہ مشکل ہے کیونکہ رینج بارہ سو فیٹ ہو چکی تھی نیچے جا کر جب ان کے یونائٹڈ نے اوپر کی طرف چڑھنا چاہا تو اس میں ایک زوردار دھچکا لگا اور اچانک جان نے کہا اُدھ۔ مزہ آگیا!.....

جہاز صاف نظر آ رہا ہے۔ وہ دیکھو سامنے!

رانسل نے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ جہاز نہایت پھرتی سے بادلوں کو چیرتا ہوا چلا جا رہا تھا جو دشمن کا جہاز ہینکل تھا اور کوئی چار سو گز کے فاصلے سے

بادلوں میں گزر رہا تھا۔ جان نے اس جہاز پر ایک نگاہ ڈالی اور سو رہی دوبارہ غوطہ لگایا تاکہ ہینکل کے نزدیک پہنچ جائیں۔ رانسے رڈار اسکرین کے پاس بیٹھ گیا اور بلندی نوٹ کرتا گیا جو نہی جہاز دشمن کے جہاز کے نیچے پہنچا انھوں نے اوپر جانے کی تیاری کی۔ اب بادلوں کچھ ہلکے ہو چلے تھے اور چاند کی روشنی چھین چھین کر نیچے آ رہی تھی کبھی کبھی بادل اتنے گہرے ہو جاتے کہ سامنے کا پیشہ بالکل دھندلا جاتا اور کچھ بھی نظر نہ آتا۔ خدا خدا کر کے ہینکل دوبارہ نظر آیا۔ اس کا فاصلہ اب ڈھائی سو گز تھا۔ جان نے جہاز کو تھوڑا پیچھے کر کے گولہ باری شروع کر دی اور ذرا ہی بمبار طیارے کے ٹکڑے اُڑا رہے کہ اس جہاز پر گرنے لگے۔ اس کا ایک انجن تباہ ہو چکا تھا۔ جان گویا برساتا رہا اور آگے بڑھتا رہا۔ اس کا ایک ہینکل بالکل بیکار ہو چکا تھا۔ انجن سے تیل بھی نکل نکل کر بہہ رہا تھا اور دھواں بھی۔ اتنے میں جان کی بندوقوں خاموش ہو گئیں کیونکہ گوتے خرچ ہو چکے تھے۔ رانسے گھبرا یا اور ایک لمحے کے لیے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا وہ پھر تہمت کر کے رڈار اسکرین کو چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اُسے یقین تھا کہ ایک انجن کے بل پر دشمن کا جہاز کچھ نہیں کر سکتا۔ اس نے جان سے کہا: کیا آپ اس وقت تک دشمن کے جہاز کا مقابلہ کر سکتے ہیں جب تک کہ میں دوبارہ بندوقوں کو لوڈ کر دوں؟

جان نے اثبات میں جواب دیا۔

رانسل نے آپس میں کھینچی، سر کی ٹوپی آمار کے ایک طرف رکھ دی اور بندوقوں کے درمیان گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ اس لمحے ان کو یونائٹڈ کی

جان نے اندیشے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔ ممکن ہے وہ اب بھی مضبوط ہو۔ آہستہ آہستہ ہینکل ایک ہموار سطح پر آگیا۔ اب وہ بیونائٹرس سے پندرہ سو فیٹ نیچے تھا مگر چند ہی لمحوں بعد وہ بادلوں میں گم ہو گیا۔“

جان پھر لولا: ”دیکھو خیال رکھو۔ ممکن ہے وہ پھر حملہ کر دے۔“ بہر حال ان کا جہاز سکون کے ساتھ اڑتا رہا اور کافی دیر تک ہینکل کو دیکھتا رہا لیکن وہ کہیں نظر نہ آیا۔ ممکن ہے وہ سیدھا گر کر تباہ ہو گیا ہو یا زخمی حالت میں اپنے ہیڈ کو اڑ پھینچ گیا ہو یا بدل نا خواستہ یہ لوگ بھی اپنے اڈے پر واپس پہنچ گئے۔

یہاں پہنچ کر انھوں نے قطعی آرام نہ کیا بلکہ دوبارہ پٹرول یا اور گولہ بارود بھرنے لگے۔ اتنے میں رڈا نے اطلاع دی: ”ہیلو! ٹو فور۔ آپ کے واسطے ایک گاہک موجود ہے! جان نے فوراً پرواز کی اور چند ثانیوں میں شکار سامنے آگیا۔ یہ ایک دوسرا ہینکل تھا۔ جہاز کے اوپر بادلوں کی ایک موٹی تہ تھی اس لیے وہ چاندنی سے محفوظ تھا۔ جان سیدھا اسی گز کے فاصلے پر پہنچ گیا۔ وہاں سے اُس نے ایک فائر کیا۔ عجیب بات تھی کہ ایک ہی فائر میں ہینکل سے کل پُرزوں اور کیلوں کی بارش شروع ہو گئی۔ اتنا بڑا جہاز بالکل سیدھا نیچے کی طرف آنے لگا اور رانسے نے جہاز کے گرنے کا آنکھوں دیکھا حال جان سے بتانا شروع کیا۔

”جہاز بالکل سیدھا دہنی طرف جا رہا ہے۔ کیا آپ اپنا جہاز نیچے لے جا

کوئی خبر نہ تھی۔ وہ رفتار پکڑنے میں لگا تھا۔ جہاز کے فرش پر بڑے زور زور کے دھچکے لگ رہے تھے۔ رانسے نے اپنے پر گھٹنے، سر اور کاندھے مضبوطی سے کسی نہ کسی سہارے سے جمائے اور دونوں ہاتھوں کو خالی کر لیا، کیونکہ ایک سے گولوں کا ٹکانا بھی ایک بڑا مرحلہ تھا۔ آخر اُس نے ایک پن نکالی، ساٹھ پونڈوزنی گولہ باہر آگیا اور ٹڑھک کر نیچے آگرا۔ لیکن رانسے نے اس کے گرنے سے قبل اپنے دونوں بازوؤں کے درمیان سہار لیا اور آہستہ سے بریچ بلاک میں رکھ دیا۔ اس کو صحیح طور پر رکھنے کے لیے لازمی تھا کہ وہ توتے دُجے کے زاویے پر رکھا جاتا چنانچہ اُس نے اُس کو ایک ہاتھ سے گھمایا اور دوسرے سے سہارا دیا۔ اس کام میں کئی بار اس کی انگلیاں کچل کچل گئیں۔ بدقت تمام گولہ صحیح جگہ پر بیٹھ گیا اور رانسے نے سامنے کی پن لگادی۔ اس جدوجہد میں وہ پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ لہذا اُس نے ذرا کمر سیدھی کی اور کچھ اکسیجن کھینچی۔ پھر دوسرا گولہ فٹ کر دیا اور جان کو جا کر اطلاع دی۔

جان نے کہا: ”ٹھیک ہے۔ وہ بھاگ رہا ہے، دو گولوں میں کام چل جائے گا۔“

رانسے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ”ہینکل“ نے بالکل سیدھے نیچے کی طرف غوطہ لگایا جب ہینکل کا فاصلہ اس سے تین سو گز رہ گیا تو جان نے پھر فائر کیا نشانہ صحیح لگا۔ ہینکل کے کچھ ٹکڑے بھرے لیکن اس کے باوجود وہ اڑتا رہا۔ پھر اس نے بہت تیز اور نمودار نیچے کی طرف غوطہ مارا۔ بیونائٹرس کی طرح لرز رہا تھا۔





**John  
Cunningham-Brithsh  
Royal Air Force  
27 July 1917 – 21 July  
2002**

سکتے ہیں۔ یہ بہتر ہے؟ — ہینکل سیدھا چلا جا رہا ہے  
شاید وہ ختم ہو چکا ہے۔

## ۱۱۔ پانچ سو میں چار

”کو وہ زمین پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اب اس میں سے شعلے بلند ہو رہے ہیں۔“ اس سے فراغت پا کر انھوں نے واپسی کا ارادہ کیا کیونکہ رائسلے کی طبیعت کچھ ٹکدر ہو رہی تھی مگر جان ابھی تھکا نہ تھا، وہ دوسرے شکار کی تلاش میں لگ گیا۔ اُس نے اپنے جہاز کو بلندی پر پہنچا دیا، چارونا چار رائسلے کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔ اتنے میں شکار مل ہی گیا۔ کوئی ایک میل کے فاصلے پر ایک ”ہینکل“ ان کی طرف آمادہ کھانی دیا۔ جان جوش میں آگیا۔ جرمن جہاز کئی سو فیٹ ان سے اُپر تھا۔ اس نے بھی انھیں یقیناً دیکھ لیا ہوگا۔ اور غالباً اسی لیے خود کو بادلوں کی تہ میں چھپا لیا تھا۔ جان بڑی پھرتی کے ساتھ ہینکل کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا لیکن ہینکل ہاتھ نہ آیا۔ وہ یقیناً بہتر پوزیشن میں تھا۔ جان جتنا اُپر جاتا ہینکل اور اُپر پہنچ جاتا۔ جان نے زیادہ دُور جانا مناسب نہ سمجھا کیونکہ اس طرح رڈار سے اس کا تعلق ٹوٹ سکتا تھا اس لیے اُس نے رائسلے سے مشورہ کر کے واپس آنے کا فیصلہ کر لیا اس طرح جس رات کا آغاز نہایت حوصلہ افزا ہوا تھا زیادہ کی گنجائش ہی نہ تھی۔ بقیہ لوگ سمندری جانوروں کی غنائن گئے۔

تھا اس کا انجام حوصلہ شکن ہوا۔ ان کا رات بھر کا حساب یہ تھا کہ ایک جہاز تمام آدمی لائف بوٹ پر بٹیلے کھڑے تھے جو ایک ماہ تک سمندر کی مار گرایا، دوسرے کو بھی غالباً بتا دیا اور تیسرے سے بچ کر آ گئے۔

ان خدمات کے صلے میں جان اور رائسلے کو برطانیہ کے ممتاز خطابات اور اعزازات سے نوازا گیا۔

دوسری جنگ عظیم اپنے عروج پر تھی۔ تمام دنیا میں جنگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ مشرق بعید میں سنگاپور اتحادیوں کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ سنگاپور میں آباد انگریز سپاہیوں اور باشندوں کو لے کر ایک ڈرچ جہاز جس کا نام روز بروم تھا وہاں سے روانہ ہو گیا تھا مگر ابھی یہ جہاز لنکا بھی پہنچا تھا کہ اُسے دشمن نے مار پیٹ کر دیا۔ روز بروم دیکھتے ہی دیکھتے طوفانی لہروں کے پھیڑوں میں آگیا اور تیزی کے ساتھ گہرائی کی طرف جانے لگا۔ اس جہاز پر پانچ سو آدمی سوار تھے جن میں سے ہینکل ایک سو بیس آدمی کے لیے اسی جہاز میں بچانے کے لیے ایک لائف بوٹ میں سوار ہو گئے کیونکہ اس لہروں اور طوفانی ہواؤں کے رحم و کرم پر چلتی رہی اور ہزاروں میل کا سفر طے کر کے ایک جزیرہ میں پہنچی لیکن جب وہ ساحل سے جا کر لگی تو اُس پر صرف چار آدمی تھے۔ ان چاروں میں ایک میں بھی تھا۔ اس سفر کی داستان دردناک ہے کہ دشمن کے بھی آئٹوکل پڑتے ہیں۔



آجائے گی۔

مگر یہ اُمید بھی غلط ثابت ہوئی اور صبح ہوتے ہی بریگیڈیر شخصیت ہو گیا مائیک بلیک وڈو نے اس کی موت کا اعلان کیا اور اپنے طور پر ہونڈ ہی اور سرکاری رسوم ادا کرنے کے بعد سمندر کے حوالے کر دیا۔

بریگیڈیر کے انتقال کے بعد بڑی خاموشی طاری رہی پھر اچانک کسی کے چلانے کی آواز نے سکوت کو توڑ دیا۔ میں نے بڑھ کر دیکھا تو بوڑھے انجینئر نے کیپٹن مائیک پر چا تو سے حملہ کر دیا تھا اور چا تو اس کی پسلیوں میں اتر چکا تھا۔ کسی نے پکار کر کہا ”پکڑ لو اس کو“ دوسرے نے ایک آدمی نے انجینئر کو پکڑ لیا۔ وہ غالباً خودکشی پر اتر آیا تھا۔ دیکھا گیا ہے کہ کوئی خودکشی کرنے لگتا ہے تو دوسروں کو بھی نقصان پہنچا کر جاتا ہے

ہو چتا ہے کہ میں تو اپنی جان سے جا رہا ہوں باقی دنیا اطمینان سے سیس رہ جائے گی۔ اسی نفسیاتی الجھن کی بنا پر وہ دوسروں کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے بہر کیف بوڑھے انجینئر نے کیپٹن کو زخمی کر کے سمندر میں چھلانگ لگا دی مائیک بھی زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا۔ بریگیڈیر کے انتقال کے بعد وہ صرف ایک دن زندہ رہ سکا۔

کیپٹن مائیک پانی کی بوتلوں کا نگران تھا۔ اس کے انتقال کے بعد پانی کی بوتلوں کی نگرانی میرے ذمہ ہو گئی۔ مگر اب صرف ڈیڑھ بوتل پانی رہ گیا تھا میں نے بوتلوں کو اپنے بستر کے نیچے چھپا لیا۔ تھوڑی دیر جاگتے رہنے کے بعد مجھے نیند آ گئی۔ کوئی گھنٹہ بھر بعد مسرزن کی آواز پر میری آنکھ کھل گئی۔ ”کیسے دیکھو دیکھو! وہ پانی پڑا ہے“ اور واقعی

بریگیڈیر پیرس بھی لائف بوٹ پر میرے ساتھ تھا۔ اس کا تالہ ہندوستان سے ملایا کر دیا گیا تھا۔ ہندوستان میں اس نے مجھے بھی تربت دی تھی۔ اس لیے میں اس سے اچھی طرح واقف تھا۔ لائف بوٹ چلنے سے ایک ہفتہ تک تو اس کی حالت اچھی رہی لیکن اس کے بعد ڈوبنے لگا۔ نہ کھانا نہ پینا اور مسلسل کھڑے رہنا جو ایک اچھی عمر کے آدمی کے لیے قریب قریب ناممکن تھا۔ پیرس کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ اس کے ہمراہ ایک نوجوان افسر مائیک بلیک وڈو بھی تھا اس کی ہر ممکن دیکھ بھال کر رہا تھا۔ وہی اس کو سنگا پور سے نکال کرایا تھا۔ وہ ہماری لائف بوٹ پر روانگی کے ایک دن بعد سوار ہوا تھا اور ۲۴ گھنٹے تک مسلسل سمندر میں تیرتا رہا تھا۔ بوٹ پر پہنچ کر اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ”ہم تم بل کر بریگیڈیر کی خدمت کریں گے۔ گبن تھوڑی دیر میں ہم دونوں نے دیکھا کہ بریگیڈیر نے سر اٹھایا بہت آہستہ سے کہا ”آؤ تھوڑی دیر کے لیے کلب چلیں۔“ اس پر ہمکو ایک دھچکا سا لگا۔ اس کے سر کی حرکت غیر معمولی تھی۔ میں نے اس کا دل رکھنے کو جواباً کہا ”ہاں چلیں گے مگر پھر کسی دن۔“

اس گفتگو کے ایک گھنٹہ کے اندر اندر بریگیڈیر نے کشتی سے اترنا شروع کر دیا۔ وہ بالکل ہوش میں نہ تھا۔ ہم دونوں نے اس کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ تھوڑی دیر تک وہ پاگلوں کی سی حرکتیں کرتا رہا پھر اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اُمید تھی کہ صبح تک کو لمبو سے کوئی امدادی پارٹی



مشورہ دیا کہ خدا سے دعا کرنی چاہیے۔ اتفاق سے اُس دن اتوار تھی مسرنن نے سب کو ایک جگہ اکٹھا کیا اور سب کے سامنے زور زور سے انجیل پڑھنے لگی۔ اس کی آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔ تمام لوگ خود بخود اس دعا میں شریک ہو گئے۔ سب پر رقت طاری تھی اور وہ گلو گڑا لکھ خدا سے معافی طلب کر رہے تھے کیونکہ اب ان کے پاس اس کے سوا کوئی اور ذریعہ نہ تھا۔ اگر مدد مل سکتی تھی تو وہ خدا ہی کی طرف سے۔ دعا کے وقت ہنسل پچاس ساٹھ آدمی بچے تھے۔

لیکن دعا بھی کوئی کام نہ آ سکی۔ اوقات گزرتا رہا اور ایک ایک ساتھی ہم سے رخصت ہوتا رہا۔ پامرا آ کر تھکے۔ اور دوسرے سبھی رخصت ہو گئے۔ گزرا آ کر تھکے بڑے رکھ رکھاؤ اور غریبوں کا آدمی تھا۔ وہ انٹرن ڈویژن میں اسسٹنٹ کوآرڈر ماسٹر جنرل رہ چکا تھا۔ راشن کی تقسیم کی ذمہ داری اسی کے سر ہوتی تھی۔ کشتی پر بھی آ کر تھکے بڑا نظم و ضبط قائم کر رکھا تھا لیکن اب تو وہ بھی موجود نہ تھا۔ رات کے وقت مسرنن نے بھی دم توڑ دیا۔ میں نے اس کی لاش کو سمندر میں پھینکوا دیا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اسی کشتی میں ایک گروہ بد معاشوں کا بھی موجود ہے۔ اس سے کچھ بعید نہیں ہے کہ وہ مسرنن کی لاش کی بے حرمتی کرے۔

بد معاشوں کا گروہ اب کھل کر سامنے آچکا تھا اس گروہ میں مرنہ پانچ تھے لیکن انہوں نے پوری کشتی میں ایک دہشت پھیلا رکھی تھی۔ لوگ پہلے ہی مصائب سے تنگ آ کر دم توڑ رہے تھے، اوپر سے ان بد معاشوں

مجھے اپنے بستر کے نیچے کسی کے ہاتھ کی حرکت محسوس ہوئی۔ میں نے پوری قوت سے ہاتھ کو پکڑ لیا۔ گھوم کر دیکھا تو وہ چیف انجینئر تھا جو ہالینڈ کارٹن والا تھا اور اپنی زبان میں چیخ رہا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ چیف انجینئر نے ایک جھٹکا دے کر ہاتھ چھڑا لیا اور سمندر میں کود گیا۔

انجینئر کے جلتے ہی جاوا کے باشندوں نے پُر پُر زے نکالے۔ وہ ابھی تک کشتی پر چپ چاپ بیٹھے تھے اور سمجھتے تھے کہ فوجی سپاہیوں کے مقابلے میں ہم لوگ بہتر ہیں کیونکہ انھیں تیز آتا تھا اور باقی لوگ فتنہ باز سے قطعی نابلد ہیں۔ اب انھوں نے کشتی چلانے کی ذمہ داری خود سنبھال لی اور ہم کو ایسا لگا جیسے کہ کشتی پر ان کی حکومت ہو گئی ہے، ہم سب غلام ہیں ہم نے ان سے پوچھنا شروع کیا: کیوں بھی سازنگ۔ اب ہم خشکی سے کتنی دُور ہیں؟ وہ ہمیشہ ہی جواب دیتے: "تید اماؤ" یعنی مجھے پتا نہیں۔

لائف بوٹ کو سمندر میں چلتے سات دن گزر چکے تھے مگر خشکی کا کہیں پتا نہ تھا۔ پانی کی آخری بوتل بھی ختم ہو چکی تھی۔ کشتی کا نگران پامر تھا۔ اس کی آنکھ کے گرد حلقے پڑ چکے تھے۔ اور پیٹ پیٹھ سے لگ گیا تھا۔ کمزوری کے مارے اُس سے کھڑا بھی نہ ہوا جا رہا تھا۔ چہرے کی ہڈیاں باہر نکل آئی تھیں اور گال چمک گئے تھے۔ کم و بیش سبھی کا یہی حال تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ مسرنن اُس کے پاس گئیں۔ دونوں میں کچھ کھسکھس ہوئی۔ پامر نے قدرے تیز آواز سے کہا: "اب تو کوئی امید باقی نہیں۔ اگر اب بھی خشکی نہ ملے تو پھر ہم سب کا خدا حافظ۔" مسرنن نے

دوسرے دن میکنزی پھر میرے پاس آیا اور اصرار کیا کہ بد معاشوں کا مقابلہ کیا جائے۔ میں نے جو بات سوچی تھی وہی میکنزی کو بتادی یعنی وہ پانچوں تو متحد ہیں اور ہر قیمت پر نقصان پہنچانا چاہتے ہیں، ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو واقعی مقابلے میں حصہ لے سکتے ہیں۔ میکنزی نے کہا میں ابھی پتا کر کے آتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ کشتی کے ہر آدمی سے ملا، ملنے کے بعد میرے پاس آیا اور کہا: ”دوست! ہم اکثریت میں ہیں۔ ہمارے ساتھ کم از کم بارہ چودہ آدمی ہیں جبکہ بد معاش صرف پانچ ہیں۔ اب تو ہو جائے مقابلہ!“ میں نے صورت حال کا بخوبی جائزہ لیا اور اس غور و فکر میں کشتی پر تھوڑی دُور نکل گیا۔ میکنزی بھی ساتھ ساتھ تھا۔ اس کی بھاگ دوڑ دیکھ کر بد معاش بھانپ گئے کہ ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ وہ لوگ ایک گوشے میں کھڑے ہماری نقل و حرکت دیکھ رہے تھے۔

اس دوران جادا کے لوگ بالکل خاموش رہے۔ انہوں نے کسی معاملے میں حصہ نہ لیا، حالانکہ انہیں بد معاشوں کا بھی حال معلوم تھا اور مصائب سے تو خود بھی دوچار تھے۔ ماحول بڑا اشتعال انگیز ہو رہا تھا۔ اچانک ایک طرف سے آواز آئی۔ ”یہ آئے، یہ آئے!“

میں نے دیکھا کہ ایک نوجوان جس کا قد مشکل سے پانچ فٹ تین اینچ ہو گا، اچھل کر سامنے آیا۔ پیچھے سے ایک بد معاش نے اُس کے سر پر اس زور کی بوتل کھینچ ماری کہ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ پھر وہ بد معاشوں نے اُسے اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا۔ یہ نوجوان ڈرم مار ڈی تھا۔

نے ناطقہ بند کر دیا تھا۔ سب سے پہلے انہوں نے ایک نوجوان سارنٹ پر حملہ کیا اور اس کے گلے پر کٹا ہوا ٹین زور سے چلا دیا۔ گلے سے خون بہہ نکلا۔ وہ گرفت سے آزاد ہو کر میرے پاس پہنچا لیکن اب اس میں رکھا ہی کیا تھا۔ کچھ دُور تک گھسٹا ہوا گیا۔ پھر اُس کی رُوح نے ساتھ نہ دیا اور جسدِ خاکی کو چھوڑ کر پرواز کر گئی۔

اسی اثناء میں انڈین آرمی آرڈیننس کور کا وارنٹ آفیسر میکنزی میرے پاس آیا اور کہنے لگا: ”خدا کے لیے گھبن کچھ کر دو۔ یہ لوگ ہم سب کو قتل کر کے بٹ کے مالک بن جائیں گے اور جدھر چاہیں گے لے جائیں گے۔“ اس وقت میں خود بھی گھبرایا ہوا تھا۔ پانچوں بد معاشوں نے میرے اُردن نچا کر رکھے تھے لیکن میں نے ذرا ہمت سے کام لیتے ہوئے انہیں ملکارا: ”تم لوگ کس لیے انسانوں کے خون سے کھیل رہے ہو، کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ خون ڈراما کھیل کر تم پرچ کر نکل جاؤ گے؟ ہم ایسا ہرگز نہ ہونے دیں گے۔“

بد معاشوں کا سرغنہ سخت مشتعل ہو گیا اور جارحانہ انداز سے ہماری طرف بڑھا پھر بولا: ”بس خاموش ہو جاؤ ورنہ تمہارا بھی یہی حشر کر دیا جائے گا۔“ سمجھ گئے نا؟ میں نے دل میں تو سوچا کہ ہماری تعداد زیادہ ہے ہم ان سے کیوں دیں لیکن زبان سے کوئی جواب نہ دیا کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ اپنے ساتھی زیادہ تو ہیں لیکن یہ کیا خبر کہ ان میں کتنے مرد ہیں۔ مجھے خاموش دیکھ کر بد معاش لوٹ گئے۔

کہ عزم و قوت ارادی ایسی چیز ہے جس سے موت بھی بھاگتی ہے۔ سینکڑوں مرقعوں پر موت کے منہ میں ہو آیا اور موت میرا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ میں نے عزم مضبوط کر لیا تھا کہ میں مروں گا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں اب تک زندہ تھا لیکن جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، ذہن میں ایک طرح کی غلش پیدا ہو چکی تھی، وہ غلش کبھی کبھی مجھے زندگی سے پیارا کر دیتی تھی۔ ایک دن ایک نوجوان میرے پاس آیا اور بڑے خلوص سے بولا: آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا ہم لوگ کبھی کیس پہنچ سکیں گے یا لوں ہی تیرے رہیں گے؟ میں نے اس کو گھمایا۔ گھبراؤ نہیں، یقیناً ہماری مشکل آسان ہوگی۔ ہر تکلیف کے بعد آرام ملتا ہے!

نوجوان نے جواب دیا آپ اپنی نصیحتیں اپنے پاس رکھیے، میں تو چلا! یہ کہہ کر وہ آگے بڑھنے لگا۔ میرا عزم اس کے عزم کے سامنے متزلزل ہو گیا اور میں نے بھی جان دینے کا ارادہ کر لیا۔ سچ بے حالات بڑے بڑے حوصلوں کو شکست دے دیتے ہیں۔ میں بھی اپنی زندگی سے عاجز اُچکا تھا۔ نوجوان کی گفتگو ایک دم مجھ پر اثر کر گئی۔ میں نے پیکر سمندر کا پانی پینا شروع کر دیا اور کھاری پانی پیتے ہی میرے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑنے لگے۔ مجھے ایسا لگا جیسے کہ میں چکر اکر گر جاؤں گا۔ نوجوان نے میرا ہاتھ پکڑا اور دونوں ایک ساتھ سمندر میں کود گئے۔ کافی گہرائی تک جانے کے بعد میں نے سانس لی۔ لیکن ابھی میرا عزم مُردہ نہیں ہوا تھا۔ ایک بار پھر میرے زندہ رہنے کے جذبات عود کر آئے۔ میں نے طے کر لیا کہ مجھے ڈوبنا نہیں چاہیے

اور ملایا کی جنگ کا ہیرو رہ چکا تھا۔ لیکن آج وہ سمندر کی لہروں میں کھو چکا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے جھٹا اشارہ کیا اور وہ تمام لوگ جنہوں نے میکنزی سے وعدہ کیا تھا کہ بد معاشوں کو مارنے میں ساتھ دیں گے فوراً آگئے۔ سب نے ایک ساتھ ان پر حملہ کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم نے انہیں پٹخ دیا۔ اب وہ زمین پر چیت تھے اور ہم ان کی چھاتیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کافی دیر تک ہماری پارٹی اور بد معاشوں کے درمیان ہاتھ پائی ہوتی رہی۔ ہم نے یہ طے کر لیا تھا کہ آج یا تو یہ نہیں یا ہم نہیں۔ ہم میں سے ہر ایک پوری قوت سے گھونے اور کٹے مار رہا تھا لیکن وہ بھی بڑے سخت جان تھے۔ برابر مقابلہ کیے جا رہے تھے۔ کافی دیر تک مقابلہ کرنے کے بعد ان کے قوی شل ہو گئے اور تمہیں جواب دے گئیں۔ معاملہ تو ہم لوگوں کے ساتھ بھی یہی تھا لیکن ہم لوگ بہ حال زیادہ تھے۔ چند لمحوں کے بعد پانچوں کے پانچوں سمندر میں تھے۔

اس طرح مسئلہ بھی حل ہو گیا اور انسانوں کی تعداد اور بھی کم ہو گئی لیکن ہم سب چلتی پھرتی لاشیں بنے ہوئے تھے۔ بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آ رہا تھا۔ ہر نیا دن زندگی سے پیاری کو اور بڑھا دیتا۔ دل اور دماغ میں مسلسل بحث جاری تھی۔ دل کہتا تھا کہ شاید کوئی صورت زندگی کی نکل آئے لیکن دماغ کہتا تھا کہ اس طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے سے کیا فائدہ!۔

میرا معاملہ بھی عجیب ہے۔ ہر موقع پر میں تجپا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے

نے انہیں بھیجا تھا۔ وہ انسانوں سے ذرا بھی نہ ڈریں اور ڈرتیں بھی کیونکر؟ انسان تو محض دیکھنے کے رہ گئے تھے چڑیوں کی موت انہیں ہبساں کھینچ کر لائی تھی۔ ادھر سب لوگ بھوکے تو تھے ہی۔ چڑیوں نے ایک بار اڑان کی اور دوسری بار وہ سسکتے ہوئے انسانوں کے سروں، ہاتھوں اور پیٹ پر آکر بیٹھنے لگیں۔ بس پھر کیا تھا، بھوکوں کے مزے ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں کشتی پر چڑیوں کے پر ہی پر نظر آنے لگے۔ گوشت سب مضم ہو چکا تھا۔

اسی طرح دن، گھنٹے، منٹ اور سیکنڈ گزرتے رہے اور وہ سفر جاری رہا جس کی منزل کا کوئی پتا نہ تھا۔!

..... پھر اس بھیانک سفر میں ایک دن وہ بھی آیا جب تمام سابقہ مصیبتیں ماند پڑ گئیں۔ ایک عظیم شجیم آدمی بندوق ہاتھ میں لیے سلسلے اکھڑا ہوا۔ میں اس کو بالکل نہ پہچانتا تھا۔ دور ایک گوشے میں جادو کے چاروں آدمی بیٹھے اُسے دیکھ رہے تھے۔ بندوق والا انہی کے پاس پہنچ گیا..... اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اس قدر جلدی ہوا کہ میں نہ دیکھ سکا البتہ اس آدمی کی آواز سنائی دی۔ ”بچاؤ، بچاؤ“ سب لوگ ادھر دیکھنے لگے۔ جادو کے دو آدمیوں نے بندوق والے آدمی کو لوہے کی سلاخوں سے مار مار کر ہولناک کر دیا تھا۔ اس میں مقابلے کی سکت ختم ہو چکی تھی۔ رات ہوتے ہوتے وہ ختم ہو گیا۔ اس سے ہم سب اس قدر خوفزدہ ہوئے کہ چپ چاپ اپنی جگہ پر رہے۔ اگر ہم ذرا بھی جلتے تو شاید وہ جادو بھی ہلاک کر ڈالتے۔ ہم نے اپنی آنکھیں بند کر لیں..... اور اسی عالم میں سو گئے۔

ابھی زندہ رہنا چاہیے، یہ سراسر بزدلی ہے! یہ سوچتے ہی میں نے فوجان کا ہاتھ جھٹک دیا۔ لہریں مجھے اُپرے آئیں۔ آنکھ کھول کر دیکھا تو کشتی ابھی صرف تین چار گز آگے بڑھی تھی۔ میں نے پوری قوت کے ساتھ اچھل کر کشتی کا ایک کنارہ پکڑ لیا اور دوسری جست میں کشتی کے اندر پہنچ گیا۔ میں بُری کانپ رہا تھا۔ پکڑے پھٹ کر علیحدہ ہو چکے تھے۔ کسی نے میری طرف توجہ نہ دی۔ غالباً اس عرصہ میں کچھ اور لوگ دم توڑ چکے ہوں گے۔ میری یہ حالت تھی کہ چہرہ اور جسم کھاری پانی سے زخمی ہو چکے تھے۔ شکل ہی بدل چکی تھی کوئی پہچانتا بھی تو آخر کیونکر؟

کشتی لہروں سے کھیلتی چلی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد آسمان پر بادل چھا، شروع ہو گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ پھر ٹھنڈی ہوا چلی اور آہستہ آہستہ بوند باندی شروع ہو گئی۔ ہم لوگوں کے لیے ایک نئی مصیبت آن کھڑی ہوئی لیکن یہ سوچ کر خوشی ہوئی کہ کچھ تیز بارش ہو تو تھوڑا سا پانی پانی بوتلوں میں بھر لیا جائے تاکہ پینے کے کام تو آئے جو نہی بارش تیز ہوئی کچھ لوگوں نے پانی کی چار بوتلیں بھر لیں۔ اب جو لوگ بچے تھے ان میں کچھ انسانیت اُچکی تھی، کسی نے بھی پانی نہ پیا بلکہ بعد کے لیے رکھ دیا۔ بارش کے پانی سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ میں پانی جو جسم کو کھائے بار ہا تھا وہ دھل گیا۔ بوتلیں بھرنے کے بعد سب نے چلوں میں پانی بھر بھر کر پینا بھی شروع کر دیا۔

اس اثنا میں کشتی پر تقریباً بارہ سمندری چڑیاں آکر بیٹھ گئیں۔ غالباً قدرت



رات گئے کسی نے میرا شانہ پکڑ کر جھنجھوڑا۔ میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ  
جاوی میرے سر ہانے کھڑا ہے اور اپنی بھونڈی آواز میں کچھ کہہ رہا ہے۔  
میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے لیکن جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ  
وہ مجھ سے کہہ رہا تھا۔

”زمین! زمین!“

## ۱۲۔ سفید خرگوش

دوسری جنگِ عظیم میں دیگر جنگوں کی طرح فریقین نے ہر ممکن طریقے  
سے دشمن کو شکست دینے کی کوشش کی۔ باقاعدہ لڑائی کے علاوہ اتحادیوں  
نے ایک طریقہ اور بھی نکالا تھا جس کو فرانس میں استعمال کیا گیا۔ یہ بڑا دلچسپ  
اور سنسنی خیز طریقہ تھا۔ برطانیہ اپنے خفیہ ایجنٹ ان مقبوضہ علاقوں میں  
بھیجتا جو اندرونی طور پر دشمن سے نبرد آزما ہوں اور اپنے کو آزاد کرنے کی  
جدوجہد کر رہے ہوں۔ اسی قسم کے خفیہ ایجنٹوں میں ایک ونگ کمانڈر  
فارسٹ پوٹامس بھی تھا جسے فرانس کا علاقہ سپرد کیا گیا تھا۔ اُس نے اپنے  
کئی خفیہ نام رکھ چھوڑے تھے انہی ناموں میں ایک نام جو بہت مقبول ہوا،  
وہ تھا ”سفید خرگوش“۔ اس نام سے دشمن کا پتا تھا اور دوستوں کے حوصلے  
بمزد ہو جاتے تھے۔ ”سفید خرگوش“ کا کام بڑا سوجھ بوجھ، ہمت اور مستعدی کا  
تھا۔ اس میں زبردست منصوبہ بندی بھی کرنی ہوتی تھی کیونکہ دشمن کے علاقے  
میں داخلی جدوجہد کرنا موت کو دعوت دینا تھا۔

اُس کے پروگرام کو نامیہ کی اُن تاریخوں میں ہوتے تھے جب چاند  
موجود ہو یعنی قمری مہینے کی وسطی تاریخوں میں۔ چنانچہ اس مرتبہ آپریشن کے

اور خاموش اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ اتنے میں انجن ایک زوردار گھڑا ہٹ کے ساتھ بند ہو گیا لیکن چند ہی سیکنڈ بعد دوبارہ اسٹارٹ ہوا اور جہاز کے پیوں نے زمین چھوڑ دی۔ اب یہ بمباریہ انگلینڈ سے فرانس کی طرف اڑ رہا تھا۔ اس زمانے میں ایک بات ساری دنیا میں مشہور ہو گئی تھی کہ راتیں دو قسم کی ہوتی ہیں، ایک صبح رات دوسری غلط رات۔ جہاز پر بیٹھا ہوا ٹامس بھی یہی سوچ رہا تھا کہ وہ صبح رات سے غلط رات کی طرف جا رہا ہے لیکن اس تصور سے اس کو ایک سکون ملا تھا کہ اس کا مقصد ہی یہی ہے کہ دنیا سے غلط رات حرف غلط کی طرح مٹ جائے۔ بس ہر رات صبح ہو۔ جہاز کے انجن میں اتنی آواز تھی کہ ٹامی اور پیسی باہم بات چیت نہ کر سکتے تھے۔ اس لیے دونوں تصورات میں گم ہو گئے اور سوچتے رہے کہ جب ہم فرانس پہنچیں گے تو چاروں طرف جرمن ہی جرمن ہوں گے، ان سے بچ بچا کر کیونکر کام کو آگے بڑھایا جائے گا۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر وہ فرانسیسی ساحل کے اوپر تھے۔ اچانک طیارہ ٹھکن توپوں کی گرج سنائی دی۔ پائلٹ نے بڑی پھرتی کے ساتھ ماز کو چکر دینا شروع کر دیا۔ وہ کبھی غوطہ لگاتا اور کبھی دائیں بائیں دوڑنے لگتا ہی جدوجہد میں انجن ایک بار پھر رک گیا۔ ٹامس اور پیسی دونوں ہی گھبرا گئے اور سوچنے لگے کہ اب پیراٹوٹ سے اتنا پڑے گا لیکن جلد ہی انجن اسٹارٹ ہو گیا۔ پائلٹ اس چکر میں تھا کہ استقبالیہ کمیٹی کا سگنل ملے تو صبح جگہ کا اندازہ ہو۔ استقبالیہ کمیٹی دراصل ان کے خفیہ اڈوں کو کہا جاتا تھا۔ اس اٹنا میں سلینٹ

یہ ۲۴ فروری کی تاریخ طے ہوئی تھی۔ ٹامس سہ پہر کو تین بجے اپنی قیام گاہ سے روانہ ہو گیا۔ راستے میں اُس نے پیسی کو بھی ہمراہ لے لیا۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ ہلکی ہلکی ہنسی بڑا لطیف دے رہی تھی۔ دُھند بھی چھائی ہوئی تھی۔ دونوں بڑے سکون کے ساتھ ٹیمپس فورڈ پہنچے جہاں اُنھوں نے ایک ایک سوپریالی چائے پی اور اپنے سامان کا معائنہ کرنے لگے۔ اُنھوں نے اس بات کا خاص التزام کیا کہ برطانیہ کی مہر کا کوئی نفاذ یا بس کا ٹکٹ وغیرہ اُن کے پاس نہ رہے۔ فرانس میں پہننے کے لیے بعض خاص کپڑے ان کے پاس تھے۔ فوجی کپڑے اتار کر اُنھوں نے عام شہریوں کے کپڑے پہنے۔ کچھ پکیٹ بڑی احتیاط سے محفوظ کیے جن میں جعلی شناختی کارڈ بھی تھے۔ ہنگامی ضرورت کے لیے سائنائڈ کی ٹکیاں واسکٹ کی جیب میں بھی رکھیں۔ ریوالور پتلون کی جیبوں میں ڈالے پیراٹوٹ کمرے کسے اور اپنے بمباریہ کے کی طرف بڑھنے لگے۔

طیارہ زیادہ بڑا نہ تھا۔ دونوں لدے پھندے تھے اس لیے جہاز کے دروازے میں داخل ہونے میں اُنھیں مشکل پیش آئی۔ جہاز میں قبل ہی سے اتنا سامان تھا کہ ریل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ اس لیے اُن کے بیٹھنے کی بھی مشکل جگہ نکل سکی۔ اُن کے جو ٹوٹ کیس وہاں رکھے ہوئے تھے۔ ان میں پہننے کے کپڑے تو کم ہی تھے۔ البتہ اسلحہ، واٹرپروٹ سیٹ اور بم وغیرہ زیادہ بھرے ہوئے تھے۔

چند لمحوں بعد جہاز کا انجن اسٹارٹ ہوا اور سیلفاکس طیارہ رن وے پر دوڑنے لگا۔ چونکہ اس میں کوئی کھڑکی نہ تھی اس لیے یہ لوگ باہر نہ دیکھ سکے

جو ساتھ آیا تھا، چلا کر بولا ہمیں جس جگہ اترنا ہے اس پر کافی نیچا ابر چھایا جواسے اس لیے جہاز اُتارنا مشکل ہے اب ہم واپس چل رہے ہیں۔  
اس پر دونوں کو بڑا غصہ آیا لیکن واپسی کے سوا کوئی پارہ نہ تھا۔  
طیارہ ٹیکن توپوں کے دہانے کھلے ہوئے تھے مگر مباران کی حد سے باہر تھا۔  
۴ بجے صبح جہاز واپس ٹیمپورڈ پہنچ گیا اور میڈ کوارٹر سے اجازت ملنے پر سب لندن آگئے۔

۲۶ فروری کو جمعہ کا دن تھا۔ آج پھر انھوں نے پروگرام بنایا۔ آدمی رات کو سب پہلے جیسے ساز و سامان کے ساتھ اُٹ گئے۔ آج کی پرواز میں کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا۔ بس دو ایک آدازیں طیارہ ٹیکن توپوں کی آئیں اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ ۳ بجے صبح اُن کا طیارہ صحیح مقام پر پہنچ گیا جو نارمنڈی میں واقع تھا۔ سارجنٹ نے تمام پکیٹ اور سامان دروازے کے قریب لگا دیا تھا تاکہ دونوں خفیہ ایجنٹ اُتر جائیں تو سامان نیچے گرا دیا جائے۔ نیچے سے برابر روشنی کے سگنل آرہے تھے۔ سب سے پہلے پیسی سامان پر چڑھ کر دروازے تک پہنچا اور جوبنی اسے سبز سگنل ملا وہ فوراً کود گیا۔ ٹامس ہٹا بکا رہ گیا۔ اب اس کی باری تھی۔ اس نے اپنے ساتھی کی بہادری دیکھی تو خود بھی بلا جھجک کود پڑا۔ پیسی نیچے نیچے تھا اور ٹامس اُوپر اور دونوں آہستہ آہستہ نیچے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ چاندنی میں وہ دو سفید چھوٹوں کی مانند نظر آ رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں دونوں ٹھنڈی ہواؤں سے کُلف اندوز ہوتے ہوئے زمین پر اُتر گئے۔ اس اثنا میں ایک آدمی

دوڑتا ہوا اُن کے پاس آیا اس نے گرجو ششی سے اُن سے ہاتھ ملایا۔ اب سامان کے بندل نیچے آ رہے تھے۔ ان میں بھی چھوٹے چھوٹے غبارے بندھے ہوئے تھے تاکہ وہ بھی آہستہ آہستہ نیچے آجائیں اور ٹوٹ پھوٹ نہ ہو۔

استقبالیہ کمیٹی نے کچھ فاصلے پر ایک غار بنا رکھا تھا جو درختوں کے جھنڈ میں چھپا ہوا تھا۔ سب لوگوں نے مل کر سامان اُسی غار میں پہنچا دیا۔ ان دونوں کو ریاں سے کوئی پندرہ کلومیٹر پر واقع ایک محفوظ مکان میں بھیجنا تھا جس کے لیے پہلے سے سائیکلوں کا بندوبست کر یا گیا تھا لیکن شہر میں نصف شب کے بعد کرفیو تھا اور جرمن سپاہی گشت پر ہوتے تھے۔ لہذا ملے یہ کیا گیا کہ اگر یہ لوگ پکڑے گئے تو سپاہیوں سے کہہ دیں گے کہ ہم ایک شادی میں گئے تھے وہاں دیر ہو گئی۔ چونکہ صبح نوکری پر جانا ہے اس لیے رات کو وہاں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا۔

یہ پروگرام بنا کر ہم لوگ مکان کی طرف روانہ ہوئے۔ آگے آگے گانڈ تھا اس کے پیچھے پیسی، اور سب کے پیچھے ٹامس۔ ٹامس کی سائیکل کے کیریئر پر ایک کبس رکھا ہوا تھا جسے ربر سے باندھ دیا گیا تھا۔ ایک مقام پر گانڈ نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اشارہ کیا کہ بالکل خاموش چلے آؤ، ذرا سی بھی آواز نہ ہونے پائے۔ ابھی وہ اشارہ کر ہی رہا تھا کہ ٹامس کا کبس سائیکل سے نیچے گر پڑا۔ رات کے سناٹے میں ایک نوردار آواز ہوئی مگر خوش قسمتی سے کسی نے دیکھا نہیں۔ گائیڈ نے پھر اشارہ کیا۔



عورت ایک مقامی کمیٹی کی بیوی تھی جو استقبالیہ کمیٹی کا رکن تھا۔ چند لمحوں بعد کمیٹی کے دوسرے اراکین بھی پہنچ گئے۔ سب سے پہلے ٹامس اور پیسی کا تعارف ہوا۔ انھوں نے دونوں کو پستول پیش کیے جو وہ ان کی حفاظت کے لیے ساتھ لے کر آئے تھے۔ پھر ان کو بتایا گیا کہ یہ سفر بہت خطرناک تھا کسی لمحے بھی کوئی مصیبت کھڑی ہو سکتی تھی۔ پیسی نے تو غضب یہ کیا تھا کہ اپنے ساتھ سائیکل پر دائر لیس سیٹ، دستی بم اور آتشیں اسلحہ بھی لے آیا تھا جس کو دیکھ کر سب ہٹکا بٹکارہ گئے۔ ہر ایک نے اللہ کا شکر ادا کیا اور نہایت رقت آمیز لہجے میں خدا سے فتح مندی کی دعائیں مانگیں۔ پھر سب نے مل کر کھانا کھایا اور سونے چلے گئے۔

دوسرے دن صبح وہ بس کے ذریعے شہر روانہ ہو گئے۔ بس بالکل کھارا تھی۔ نشستیں ٹوٹی پھوٹی اور اسپرنگ باہر نکلے ہوئے تھے۔ مسافر زیادہ تر کسان تھے جو اپنا سامان چور بازار میں فروخت کرنے کے لیے شہر جا رہے تھے۔ وہ آپس میں بات کرنا نہ چاہتے تھے کیونکہ انھیں ہر وقت خوف لگا رہتا کہ کہیں کوئی جرمن ایجنٹ موجود نہ ہو۔ پیاز، سرکہ اور شراب کی بدبو بس بھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ ٹامس بس کی کھڑکی سے ادھر ادھر دیکھتا چلا جاتا تھا۔ بجے شب میں وہ گیسٹریٹ لڑکے کے اسٹیشن پر پہنچے۔ ہر طرف بلیک آؤٹ تھا۔ لوگ اندھیرے میں ٹاپک ٹونیاں مارتے مضافاتی ٹرینوں کو پکڑ رہے تھے۔ جرمن فوجی بھی بے دھڑک دوڑ رہے تھے۔ ان میں نظم و ضبط بہت تھا۔ ٹامس سب کو بغور دیکھتا رہا۔

بالکل چپ چاپ آؤ، کیا غضب کر رہے ہو۔ اب ٹامس سائیکل سے اتر پڑا اور بکس کو دوبارہ باندھنے لگا لیکن رستی گھس کر ٹوٹ چکی تھی۔ ٹامس بڑا گھبرایا۔ چارونا چار بکس کو سینڈل پر رکھا اور ایک طرف سے اپنے سینے سے سہارا دیا۔ ہدقت تمام سائیکل پر دوبارہ سوار ہوا مگر تھوڑی ہی دور گیا ہوگا کہ ایک گڑھے میں ایک زوردار دھچکا لگا۔ بکس گھنٹی سے ٹکرایا اور ٹن سے آواز ہوئی جو رات کے سناتے میں بہت تیز سنائی دی۔ گائیڈ نے ایک بار پھر گھورا۔ ٹامس نے اپنا رد مال گھنٹی سے باندھ دیا تاکہ آواز نہ ہو۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد گائیڈ کو شبہ ہوا کہ جرمن سپاہی آگئے ہیں اُس نے سب کو اشارہ کیا کہ چھپ جائیں۔ چنانچہ سب لوگ بھاگ بھاگ کر ایک قریبی نالے میں چھپ گئے۔ خطرہ ختم ہونے کے بعد دوبارہ باہر آئے اور پھر چلنا شروع کیا۔ غرض بڑی مصیبت سے سفر پورا کیا۔

ٹامس کے ساتھ ایک شکل یہ بھی تھی کہ اس کا قد چھوٹا تھا جبکہ سائیکل کافی اونچی تھی اس لیے جب وہ سائیکل پر سوار ہونا چاہتا تو کسی اونچی جگہ کو تلاش کرتا اور اس کے سہارے سے چڑھتا تھا۔

جب وہ اپنے خفیہ مکان تک پہنچا تو اُس کا سینہ زخمی ہو چکا تھا، انگلیاں بکس کی وجہ سے پکپ گئی تھیں اور ٹانگوں میں سخت درد تھا۔ مکان کا ایک چھوٹا سا دروازہ تھا جس میں سے ہو کر سب اندر گئے۔ وہاں بہت بڑا کمرہ تھا جس میں روشنی ہو رہی تھی۔ سب سے پہلے ایک خوبصورت اور جوان عورت نے بڑھ کر اُن کا استقبال کیا جس کا نام میڈم ونٹ تھا۔ یہ

میں جرم بھی تھے اور فرانسیسی بھی۔ ٹامس پہرہ دیکھ کر پہلے تو کچھ ٹھسکا اور سوچا کہ واپس چلا جائے۔ پھر اس خیال سے کہیں سپاہی کسی شک میں نہ مبتلا نہ ہو جائیں، وہ سیدھا ہی چلتا گیا۔ سپاہیوں کے قریب پہنچ کر اُس نے اپنا نقلی شناختی کارڈ پیش کر دیا۔ اس کارڈ کو کبھی تو جرم سپاہی دیکھتا اور کبھی فرانسیسی سپاہی۔ کوئی تصویر دیکھتا تو کوئی اس پر بھی ہوئی عبارت پڑھنے لگتا۔ ٹامس کا دل دھڑکنے لگا۔ اور آنکھوں کے سامنے موت ناچتی نظر آنے لگی۔ اس موقع پر اُس نے اپنے دوست سے بڑی لاتعلقی اور بے نیازی کا اظہار کیا۔ سپاہیوں نے کچھ دیر تک شناختی کارڈ کا پوسٹ مارٹم کرنے کے بعد واپس کر دیا اور اُنے جانے کی اجازت دے دی۔

اجازت ملنے پر اُسے بڑا اطمینان ہوا کہ جعل سازی پکٹی ہے اب وہ اس شناختی کارڈ کو ہر جگہ اعتماد سے پیش کر سکتا ہے، مگر ابھی وہ چند قدم ہی چلا ہو گا کہ پولیس کا ایک اور حلقہ نظر آیا۔ اب اُسے شک ہونے لگا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ گھیسالپو کو اس کے آنے کی اطلاع مل گئی ہو اور اسی کی تلاش میں یہ پولیس سرگرداں ہو۔ لیکن اب شک و شبہ کو ختم کرنے کا واحد طریقہ یہی تھا کہ اُسے سہمت سے آگے بڑھتے رہنا چاہیے تھا۔ چنانچہ ٹامس نے ایسا ہی کیا۔ بڑی بے نیازی کے ساتھ کارڈ دوسرے پولیس والے کے آگے بڑھا دیا۔ اُس نے کارڈ دیکھا اور فوراً ہی آگے جانے کی اجازت دے دی۔ سامنے ایک قیدی کی گاڑی کھڑی تھی اور پولیس والے چار آدمیوں کو دھکے دیتے ہوئے اُدھر لیے جا رہے تھے۔ ٹامس کی توجہ ان ہی نکل گئی لیکن وہ

یہ لوگ بھی ایک ٹرین سے ایوڈمی لافیسانڈری پہنچے۔ وہاں ان کا ایک اور ساتھی بردسولیت انتظار کر رہا تھا۔ وہ انہیں ایک فلیٹ میں لے گیا جو بڑا محفوظ تھا کیونکہ اس بلڈنگ پر گیسٹاپو (نازی خفیہ تنظیم) کا قبضہ تھا۔ صرف ایک کمرہ ان لوگوں کے پاس تھا۔ جرمیوں کو ذرا سا بھی شک نہ ہو سکتا تھا کہ دشمن اُن کے درمیان میں بھی رہ سکتا ہے۔ یہاں پہنچتے ہی سب نے اطمینان سے کھانا کھایا اس کے بعد طے ہوا کہ سب ایک جگہ نہ رہیں بلکہ چھوٹی چھوٹی ٹمکڑیوں میں بٹ جائیں۔ چنانچہ ٹامس کو ایک دوسرے فلیٹ میں پہنچا دیا گیا کیونکہ اس کو دوسرے دن ایجبے پسی اور بردسولٹ سے ملاقات کرنی تھی۔ ٹامس وہیں سو گیا۔

دوسرے دن صبح وہ ٹہلنے کے لیے نکلا۔ پہلی بار مقبوضہ پیرس کے منظر کو دیکھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے ایک عزم کر لیا کہ اب وہ بیشتر وقت دشمن کے نیچے میں گزارے گا اور جہاں تک ممکن ہو گا فرانسیسی آبادی میں گھل مل کر جرم سپاہیوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھے گا۔ سڑکوں پر مکمل سکوت طاری تھا۔ کبھی کبھار کوئی جرمی اسٹاف کار یا لاری گزرنے سے سکوت ٹوٹ جاتا تھا۔ کچھ آگے بڑھا تو اُس کو ایک سڑک پر بہت چہل پل نظر آئی۔ سائیکل اور رکشا تو بڑی تعداد میں چل رہے تھے لیکن لوگوں کی مالی حالت بہت خستہ تھی، لباس اور وضع قطع سے انتہائی مفلسی اور پریشان حالی شکستہ تھی، ٹھنڈے بچنے کے لیے سب نے ٹکڑی کے تلے والے بچتے پہن رکھے تھے۔ ٹامس ٹہلتا چلا جا رہا تھا کہ کچھ دور سڑک کے بیچوں بیچ پولیس کا پہرہ دیکھا۔ سپاہیوں

تھا۔ بقیہ لوگ بھی اسی طرح وہاں پہنچے اور سب مل کر اپنے جہاز کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ ایک طرف تو اُن کے دل دھڑک رہے تھے اور پکڑے جانے کا خوف جسم میں ایک جھرجھری پیدا کر رہا تھا، دوسری طرف خوشی بھی تھی کہ کام مکمل کر کے واپس ہو رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ہوا میں ایک کھڑکھڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ دونوں طرف سے سگنل دیے گئے۔ تین منٹ کے اندر اندر بیسی، بروسلوٹ، ٹامس، ریان اور اُن کے بکس جہاز میں پہنچ گئے اور جہاز بلند یوں پر پرواز کرنے لگا۔

دوسرے دن شام کو بی بی سی کی فرانسیسی نشریات میں اعلان ہوا کہ منہاسفید خرگوش اپنے ٹھکانے پر واپس آچکا ہے۔“



White Rabbit

ہمت کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ ٹھیک ۱۱ بجے وہ پورٹ میلاد پہنچ گیا جہاں بیسی اور بروسلوٹ پہلے سے موجود تھے۔ اس کے پہنچتے ہی کام شروع ہو گیا۔ بیسی نے خفیہ اطلاعات پر غور و خوض شروع کر دیا جبکہ ٹامس نے دوسرے ایجنٹوں کو مختلف مہموں پر روانہ کیا۔ ان کاموں کی تفصیل بھی صیغہ راز میں رکھی جاتی تھی۔

۱۴ اپریل کو لندن سے ان تینوں کو واپسی کا حکم ملا۔ وہ لوگ فوراً گیٹر سینٹ لزارے سے روانہ ہو گئے۔ واپسی میں اُن کے ساتھ ایک امریکن پائلٹ بھی تھا۔ اس کا نام ریان تھا جو گولی سے زخمی ہو گیا تھا۔ اس کے شانے کی بڑھی ٹوٹ گئی تھی لیکن ایک پروفیسر نے اس کی نہ صرف جان بچائی تھی بلکہ بڑھی بھی اپنی جگہ بٹھادی تھی۔ ریان کو فرانسیسی بالکل نہ آتی تھی۔ اس کو ان لوگوں نے ہاں یا نہیں کے الفاظ فرانسیسی زبان میں سکھا دیے اور یہ ہدایت کر دی کہ تم کوئی بات نہ کرنا۔ اس کے ہاتھ میں ایک فرانسیسی اخبار دے دیا، جسے وہ دیکھتا چلا گیا۔ انھوں نے اپنا سفر پیدل، سائیکل اور لوکل ٹرین سے کیا۔ مغرب بعد یہ لوگ گاؤں پہنچ گئے۔ ٹامس اور امریکن پائلٹ ایک کسان کے یہاں ٹھہرے جبکہ بیسی اور بروسلوٹ میڈم ونٹ کے گھر پہنچ گئے۔ ریان نے کسی مرتبہ بلا ارادہ بلند آواز سے امریکی بھے میں انگریزی بولی لیکن کسان کی بیوی کے منع کرنے پر مان گیا۔

ساڑھے دس بجے رات میں ٹامس اور ریان ایک دین میں آکر کیڑیوں کے پیچھے چھپ کر اس جگہ پہنچے جہاں سے انھیں ایک جہاز کے ذریعے لندن جانا

ہشکل یہ بھی تھی کہ اگر میں فرار ہوتا تو مجھے نہ تو جرمنی والے مُعات کرتے اور نہ اتحادی بخشے۔ کیونکہ ہٹلر کی فوج سے بھاگتا تو ان کا مجرم بننا اور برطانوی سپاہی دیکھتے تو نازی سمجھ کر قید کر لیتے۔

اس بے مقصد زندگی سے میں اس قدر عاجز آچکا تھا کہ آخر ایک دن اگر ٹکڑا اور خوف کو پس پشت ڈال کر مغربی افریقہ کی طرف نکل کھڑا ہوا یہ علامت پر لگائیوں کے قبضے میں تھا۔ اب میں تھا اور میرا پستول۔ اس کے علاوہ نہ پیسہ نہ کوڑی، نہ کھانا نہ پانی، کچھ بھی تو نہ تھا، پھر منزل کا بھی کوئی نشان نہ تھا، تاہم نظر رگستان ہی رگستان، کہیں کہیں اکاڈ کا پہاڑ یاں بھی نظر آ جاتی تھیں لیکن وہ بھی سیاہ پتھر جی، جن پر سبزہ جیسی کوئی چیز نہ تھی۔ میں گرتا پڑتا چلا جا رہا تھا۔ چلتے چلتے ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں سے واپسی ناممکن تھی۔

لگا تار کئی میل کے سفر کی وجہ سے میری پنڈلیوں میں اینٹھن شروع ہو گئی تھی۔ میں نے جوئے اتار لیے اور ننگے پاؤں چلنے لگا۔ اس طرح پیروں کو کچھ سکون ملا اور جو تلوں کی آواز بھی ختم ہو گئی۔ سامنے ایک پہاڑی نظر آئی۔ سوچا کہ اب اس پر آرام کر لیا جائے کچھ اوپر گیا اور ایک سپاٹ جگہ پر جو تلوں کا تکیہ بنا کر لیٹ گیا۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ آسمان پر ستارے چمکے ہوئے تھے لیکن پہاڑی کی تپش ابھی باقی تھی۔ مجھے نیند آگئی اور میں گرمی نیند سو گیا لیکن ۲ بجے کے بعد اُس گرنے لگی اور سردی بہت بڑھ گئی۔ تھوڑی دیر کر ٹپس بدلیں۔ پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب آسمان پر صبح کی سپیدی نمودار ہونے لگی تھی، اب پھر نہیں تھا اور میرا سفر۔ تمام دنیا میری مخالف تھی لیکن میں بڑے اعتماد

## ۱۳۔ دوست یا دشمن

یوں تو فوج کی ملازمت بڑی سخت ہوتی ہے لیکن اگر سپاہی کو یہ بتادیا جائے کہ تم ایک اعلیٰ مقصد کے لیے جدوجہد کرنے والوں میں پیش پیش ہو اور تمہاری زندگی حق و صداقت کے لیے وقف ہو چکی ہے تو یقیناً اس کا حوصلہ دوچند اور ملازمت پر کشش ہو جائے گی۔ میرے ساتھ ایسی کوئی بات نہ تھی۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ میں چند سکوں کے لیے اپنی جان جو رکھوں میں ڈال رہا ہوں۔ میری حکومت کے سامنے کوئی اعلیٰ مقصد تھا اور نہ مجھے سچائی کی لگن۔ یہ بات ہر وقت مجھے گھٹن کی طرح کھائے جا رہی تھی چنانچہ میں بہر قیمت میدان جنگ کو چھوڑ بھاگنا چاہتا تھا لیکن یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے سیاہ بادل تمام خطہ زمین پر چھائے ہوئے تھے۔ بموں، توپوں اور رائفلوں کی گھن گرج سے دنیا گونج رہی تھی۔ ملکوں ملکوں اور شہروں شہروں میں جاسوسوں اور فوجوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ میں اپنے ہیٹ کو اڑے سے افریقہ بھیج دیا گیا تھا کیونکہ میری حیثیت ایک خبر رساں کی تھی۔ افریقہ سے میں ٹھیک طرح واقف بھی نہ تھا۔ پھر میرے ساتھ ایک

ایک تربیتی جہاز اپنے دونوں بازو پھیلائے میرے اوپر سے گزر گیا۔ میں جھٹ ایک چٹان کی آڑ میں چاروں خانے چت لیٹ گیا۔ جہاز تقریباً پہاڑ کی چوٹی کو چھوتا ہوا گزرا۔ مجھے یہ خیال آیا کہ یہ ضرور میری تلاش میں نکلا ہوگا۔ اب میں نے وہاں مزید رکننا مناسب نہ سمجھا اور چلنے کے لیے جوتے پہننے لگا۔ لیکن پیروں پر درم ہونے کی وجہ سے جوتے میں وہ جا ہی نہ سکے۔ چاروں چار میں نے جوتے کو کہیں کہیں سے کاٹ دیا اور کسی نہ کسی طرح جوتا پہننے کے قابل ہو گیا اور میں جوتا پہن کر ایک طرف روانہ ہو گیا۔

تین گھنٹے تک چلتے رہنے کے بعد مجھے پیاس لگ آئی۔ پانی حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اچانک کچھ دور ایک پگڈنڈی پر کچھ دھول اٹھتی نظر آئی۔ کوئی پندرہ منٹ بعد معلوم ہوا کہ چودہ جرمن ٹرکوں کا ایک تانہ جارہا ہے۔ ان کے دروازوں کے پاس پانی کی ٹنکیاں رکھی تھیں۔ مجھے دیکھ کر لاپرواہی میں سے ایک ٹنکی آسانی سے حاصل کی جاسکتی تھی۔ بس ایک گولی چلانے کی دیر تھی۔ لیکن ایک ٹرک ہوتا تو یہ کام بڑی آسانی سے ہو سکتا تھا اس لیے دیکھ کر رہ گیا۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد ایک موٹر سائیکل سوار سپاہی البتہ سے آتا دکھائی دیا جس کے پاس پانی کی ایک چھال تھی۔ بہت جی چاہا کہ اس کا خاتمہ کر کے نہ صرف پانی حاصل کیا جائے بلکہ ایک عدد موٹر سائیکل بھی۔ اس طرح سفر میں بہت آسانی ہو جائے گی۔ میں اپنے پستول سے گولی چلانا ہی چاہتا تھا کہ اندر کے انسان نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ خدا بھلا کرے میری شرافت کا فوراً یہ خیال آیا کہ یہ بھی کوئی انسانیت

کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ کچھ دور چل کر میں نے پہاڑی کی چوٹی کے سامنے نظر دوڑائی تو سامنے البتہ کا شہر تھا۔ لوگ جاگنا شروع ہو گئے تھے۔ کہیں کہیں چراغ جل رہے تھے، کہیں ٹمٹما رہے تھے۔ انجن اور موٹر کی آواز دن کی آمد کا پیغام دے رہی تھی۔ دوسری طرف البتہ کی مخالفت سمت میں کوئی دو فرلانگ پر کچھ لوگ آگ جلائے بیٹھے تھے۔ غالباً یہ عرب تھے۔ مجھے تو اپنے ساتھی سے بھی ڈر لگ رہا تھا گشتی سپاہی اور عرب بدوؤں کا کیا کہنا وہ تو تھے ہی ہمارے دشمن۔ بہر حال میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اب کدھر جاؤں۔ پیروں کو کچھ آرام ملا۔ تو وہ سوچ کر گیا ہو گئے تھے۔ اپنی اس حالت پر آنکھوں کے سامنے ہندوستانی فیکر کی تصویر پھر گئی اور مجھے ایک دم ہنسی آگئی۔ پہاڑی کی سونکھی اور نیچ منج جھاڑیوں پر شبنم کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ معاً خیال آیا کہ کیوں نہ اس پانی کو پی لیا جائے تاکہ ان میں پیاس کم لگے۔ میں نے جھٹ فیس اتاری اور جھاڑی کے نیچے بچھا کر جھاڑیوں کو نور سے بلایا۔ فیس شبنم سے بھیگ گئی۔ اُسے اٹھا کر منہ میں پھونڈ لیا۔ پھر دوسری جھاڑی کے نیچے بچھا لی اور شبنم گرا کر منہ میں پھونڈ لی۔ اس طرح لگانا چھ مرتبہ اس عمل کو دہرایا۔ پھر بھیگی فیس سے پیروں کے تلوے پونچھے تاکہ زخموں کی مٹی صاف ہو جائے۔ اس کے بعد اُس کو پیروں پر پیٹ لیا تاکہ سوچے ہوئے پیروں کو کچھ آرام ملے۔

صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ساتھ ایک تیز گھڑ گھڑا ہٹ سنا دی۔ یہ آواز ٹرکوں پر چلنے والی گاڑیوں کی آواز سے مختلف تھی نہ دوسرے لمحے

تھا۔ فکر صرف اس بات کی تھی کہ ٹرک پر ایک ڈرائیور ہے یا دو؟ اس پر ساز و سامان ہے یا فوجی سفر کر رہے ہیں؟ جونہی گاڑی نزدیک آئی میں نے دیکھ لیا کہ وہ ٹرک ہی ہے۔ اب ٹرک چڑھائی پر آ رہا تھا۔ میں جس جگہ کھڑا تھا وہاں سے ٹرک تقریباً بیس فیٹ نیچے تھی۔ اتنے میں مجھے گھیر بدینے کی آواز سنائی دی۔ اب ٹرک کی رفتار بہت شست ہو چکی تھی۔ میں چٹان پر اوندھا لیٹ گیا اور گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ جونہی وہ ٹرک موڑ سے ٹرک سامنے آیا میں نے پہچان لیا کہ یہ جرمن اد پیل ٹرک ہے اور اس میں صرف ایک آدمی بیٹھا ہے۔ سامنے سے حملہ کرنا مناسب نہ تھا اس لیے جب وہ تھوڑا آگے بڑھا اور کچھلا حصہ نظر آیا جس پر تریپال پڑا ہوا تھا اور کہیں کہیں سے پھٹا ہوا بھی تھا تو میں نے اچھی طرح نظر جاکر دیکھا کہ اس میں کوئی سپاہی تو نہیں بیٹھا ہے؟

یہ اطمینان ہو جانے کے بعد میں دوڑ کر آگے بڑھا اور ڈرائیور کے پاس والی کھڑکی پر گولی چلا دی۔ ڈرائیور دہشت زدہ ہو گیا اور گھبراہٹ میں اس نے ٹرک ٹرک سے پتھوٹی زمین پر چڑھا دیا۔ میں نے چلا کر کہا: "خبردار جو آگے بڑھے۔" ٹھہر جاؤ اپنی جگہ پر۔" ٹرک ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی جگہ جام ہو گیا۔ میں نے دوبارہ گرج کر کہا: "ہیڈ زاپ!!" اپنے ہاتھ ایسی جگہ رکھو جہاں مجھے نظر آئیں۔" اس نے اپنے ہاتھ اوپر کر لیے۔ میں فوراً ٹرک پر پہنچ گیا اور سپتول کی نالی اس کے سینے پر رکھ دی۔ وہ گھڑی گھڑی اپنے ہونٹوں کو جنبش دے رہا تھا غالباً وہ کچھ کہنا

ہے کہ ایک تنہا سپاہی کو اکیلا جان کر ہلاک کر دیا جائے اور سپاہی بھی کیسا جو محض پیغام رسانی پر مامور ہو۔! ہاں اگر وہ گولی چلانے میں پہل کرے تو پھر میں بھی جواب دوں گا۔ اسی سرچ سچا میں وہ دور نکل گیا۔ دن تیزی سے چڑھ رہا تھا۔ سورج کافی بلند ہو چکا تھا۔ اسی کے ساتھ ہی ساتھ میری پیاس بھی بڑھ رہی تھی۔ اب مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ موٹر سیکل واے کو کیوں چھوڑ دیا۔ کم از کم پانی تو پینے کو مل ہی جاتا۔ سوچتے سوچتے ایک ترکیب سمجھ میں آئی کہ پلو واپس چلیں اور اس چوکی کے اطالوی سنتری سے طیس جس سے کل بات ہوئی تھی۔ وہاں پہنچ کر موقع محل دیکھ کر اس کو ختم کر دیں گے اور پانی حاصل کر لیں گے۔ لیکن یہ ترکیب بھی محض خیالی تھی کیونکہ ایک تھکے مارے آدمی کا واپس جانا اور بھی مشکل ہوتا ہے اس سے قطع نظر اگر اطالوی سنتری نے گولی چلانے میں پہل کر دی تو کیا ہوگا۔ وہاں سے بھاگنے کا بھی تو راستہ نہ ملے گا۔ چنانچہ یہ ترکیب بھی خیالی پلاؤ ثابت ہوئی۔ بس یہی سمجھ میں آیا کہ کسی نہ کسی ترکیب سے اسی جگہ پانی کا انتظام ہو جائے۔ یہ خیال آتے ہی کافی دور گرد و غبار کا ایک طوفان نظر آیا۔ یہ غبار کسی ایک ٹرک کا تھا کیونکہ اگر کئی ٹرک ہوتے تو دھول کی ایک دیوار سی نظر آتی۔

اب میری ہمت کا امتحان تھا۔ چند لمحوں بعد مجھے گولی یا پانی کسی ایک چیز کا انتخاب کرنا تھا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ آخر میں نے سپتول سنبھالا اور ٹرک کے موڑ پر چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ اس جگہ سے میں اچھی طرح واقف

چاہتا تھا لیکن مارے ڈر کے اُس کی آواز نہ نکل رہی تھی۔ میں نے ایک ہاتھ سے تلاشی لی تاکہ اگر کوئی تیغیا رہو تو چھین لوں لیکن اس کے پاس کچھ نہ نکلا۔ وہ ہر طرف تیس اور نیکر پہنے تھا۔

اب میرے حوصلے بلند ہو چکے تھے۔ میں نے زوردار آواز سے کہا: "بھار اسلو کہہ رہیں؟" اُس نے اشارے سے کہا کہ دروازے کے ساتھ والی پاکٹ میں۔ میں نے اپنی آنکھیں اُسی کی طرف جمائے رکھیں اور ہاتھ کو پاکٹ میں ڈال کر دیکھا اس میں ایک پستول رکھا تھا۔ میں نے اُسے نکال کر اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔ اب میں نے حکم دیا: "چلو ٹرک گھما لو!" اُس نے بالکل خاموشی سے ٹرک اشارٹ کیا اور اُسے گھمانے لگا۔ میں نے جلدی جلدی چاروں طرف نظر دوڑائی تاکہ بانی کی بوتل دکھائی دے جائے۔ بوتل اُس کے سامنے ڈیش بورڈ کے نیچے ٹک رہی تھی۔ ڈرائیو گارڈی گھمانے میں مصروف تھا۔ میں نے موقع غنیمت جان کر بوتل اٹھا لی اور غٹ غٹ پانی پینا شروع کر دیا۔ اُس وقت گرم پانی میں جو مزہ آیا ہے وہ شاید پھر کبھی اچھے سے اچھے بونس میں نہ آیا۔ پانی کیا تھا اب حیات تھا۔!

"آپ کتنی دُور واپس لے جانا چاہتے ہیں۔؟" ڈرائیو نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا: "بٹنوار تمہارا نام کیا ہے؟" اور یہ کہہ کر پستول کی نالی اُس کے سینے سے پٹالی۔

"جناب کا شکریہ! مجھے تو ایسا لگ رہا تھا کہ یہ نالی پسلیوں کو توڑتی اندر نکل ہو جائے گی۔" اُس نے ایک جذبہ تشکر کے ساتھ کہا "میرا نام ہمدست ہے۔ سپلائی کمپنی کا آدمی ہوں جو پندرھویں مینرز ڈویژن سے منسلک ہے۔"

اس کے پتہ نشان بتانے پر مجھے یاد آیا کہ کچھ مہینے پہلے میرا اور اس کا یونٹ الادم ہوائی اڈہ پر قریب قریب ایک ہی جگہ تھے۔ اب مجھے اپنا تعارف کرنے کی شاید ضرورت نہ پڑے۔ میں یہ بات سوچ ہی رہا تھا کہ وہ بولا: "آپ کا نام بائین ہے، کیوں ٹھیک ہے نا۔" میں نے کوئی جواب نہ دیا اور تھوڑا پانی اور پی گیا۔

پھر میں بولا: "تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا۔" اور ہاں یہ تو ذرا تباؤ کہ تمہارے پاس اور پانی بھی ہے؟" مجھے فکر یہ تھی کہ بوتل کا وزن تیزی سے کم ہو رہا تھا۔

"تین ڈبوں میں اور پانی موجود ہے۔" اُس نے جواب دیا۔

مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ ٹرک کے ساتھ ساتھ پانی کا ذخیرہ بھی مل گیا۔ اب میں نے پوچھا: "اور کھانا بھی ہے تمہارے پاس۔؟" اُس نے کہا "میرے پاس اتنا کھانا ہے کہ ایک کمپنی چار روز تک کھائے تب بھی بچ رہے گا۔"

"اور پٹرول؟"

"ایک ڈرم پٹرول کا رکھا ہوا ہے اس کے علاوہ ٹنکی میں موجود ہے۔" اُس نے جواب دیا۔

مارے خوشی کے میرا ہر حال ہو رہا تھا۔ میں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔



اب میری پریشانیوں کا خاتمہ ہو جائے گا اور میں صاپت پنچ نکلوں گا۔  
میں نے ڈرائیور کو یقین دلایا: تم اطمینان رکھو۔ اگر تم نے کچھ گڑبڑ نہ کی تو تمہیں  
ذرا سی بھی گزند نہ پہنچے گی۔ تم اطمینان سے جہاں چاہو چلے جاؤ۔ میں تمہارا ٹرک  
لیے جا رہا ہوں۔ سمجھ گئے!!

اُس نے جواب دیا آپ یقین جانیے، میں کوئی غلط قدم نہیں اٹھاؤں گا۔  
مجھے اکیلا چھوڑ دیجیے اور ٹرک لے کر جہاں چاہیں چلے جائیں۔

اُس کی باتوں سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ اُس  
کی آنکھوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ میرا شکریہ گزار رہے کیونکہ میں اُس کو زندہ سلامت  
جانے کی اجازت دے رہا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس کے سامنے اور کوئی راستہ  
ہی نہ تھا۔ ہماری گاڑی فرار سے بھرتی چلی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں ہم لوگ بھلیفہ  
پہنچ گئے۔ جہاں ایک بڑی چٹان کے سامنے میں نے ٹرک کو رکوا لیا۔

میں نے اُس سے کہا: اگر یہاں کوئی آدمی مل جائے تو تم ہی ظاہر کرنا کہ تم  
اپنے مشن پر نکلے ہو اور میں تمہارا ساتھی ہوں۔ اس کے علاوہ اور کوئی بات نہ بتانا۔  
اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور چاروں طرف نگاہ دوڑائی تاکہ کوئی نہ دیکھ  
والا مل جائے۔ وہ غالباً اس نکر میں تھا کہ کسی صورت مجھ سے چھٹکارا حاصل کرے  
لیکن کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے میں نے کہا: اب تم جا سکتے  
ہو۔ جب وہ دروازہ کھول کر ٹرک سے اترنے لگا تو میں اُس کی حرکات و سکنات  
کو بغور دیکھتا رہا۔ اُس نے اترتے ہی میری طرف گھوم کر کہا: ارے بھائی کچھ پانی  
تو مجھے دے دو۔ کیا میں اس تنگل میں بغیر پانی ہی کے چلا جاؤں۔؟

کیوں نہیں۔؟ لیکن کیا تم چند گھنٹے بھی بغیر پانی کے نہیں رہ سکتے جب کہ  
سارا دن پیاسا رہ کر پیدل سفر کر چکا ہوں۔ تم کو تو ابھی کوئی گاڑی والا  
لفٹ دے دے گا اور تم اپنے ہیڈ کو اوپر پہنچ جاؤ گے۔

اُس نے کوئی جواب نہ دیا اور چپ چاپ ایک چٹان پر بیٹھ گیا۔  
میں نے کہا: بہتر یہ ہے کہ تم پانی اُبال کے کافی بناؤ جب تک کہ  
میں دیکھوں کہ ٹرک میں اور کیا کیا مال ہے۔ اُس نے حیرت سے جواب  
دیا: تو کیا آپ ابھی جلنے کے موڑ میں نہیں ہیں؟  
”نہیں! ہرگز نہیں!! کم از کم آج رات تک تو تم میرے ساتھ ہو“ میں  
نے کہا۔

”افوہ۔ رات میں مجھے کون سی لفٹ مل جائے گی؟“ اُس نے شکایت  
کے انداز میں کہا۔ تو پھر میں کیا کروں؟ اور اگر رات بھر انتظار کر کے دوسرے  
صبح چلے جاؤ گے تو کوئی قیامت تو نہیں آجائے گی۔

مورسٹ نے میرے حکم کی تعمیل میں پانی کھولا کر کانی بنائی۔ میں اُس کو  
دیکھتا گیا اور ساتھ ساتھ ٹرک کی تلاشی لیتا رہا۔ میں یہ اندازہ نہ کر سکا کہ آیا  
وہ مجھ سے ڈر کر تمام کام کر رہا ہے یا موقع کی تلاشی میں ہے اور کسی بھی وقت  
مجھ پر حملہ آور ہو سکتا ہے۔ بہر کیف مورسٹ نے کانی تیار کی۔ دونوں نے  
کافی پی اور ساتھ تو س بھی کھائے۔ اس دوران میں مکمل خاموشی رہی۔

آخر اُس نے سکوت کو توڑا اور آنکھوں سے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے  
کہا: آپ فوج سے کیوں فرار ہو گئے۔؟



”یہ ایک لمبی کہانی ہے ہورسٹ، اور پھر تم سمجھ بھی نہیں سکتے آئیں نے جواب دیا۔

”واقعی میں نہ سمجھ سکوں گا۔ یہ ایک مہم سے کم نہیں کہ ایک آدمی جس کو اس قدر اعزاز ملے ہوں وہ فوج کو چھوڑ بیٹھے۔“ ہورسٹ نے آہستہ سے کہا ”چھوڑو ان باتوں کو، آؤ چلیں۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

شام ہو چکی تھی۔ میں نے ضروری چیزیں ہورسٹ کو دیں اور اپنے چلنے کی تیاری کرنے لگا۔ ہورسٹ نے رات گزارنے کے لیے ایک جگہ تلاش کر لی رات ہوتے ہی میں ٹرک میں ڈرائیور کی جگہ بیٹھا۔ ہاتھ ہلا کر ہورسٹ کو خدا حافظ کہا۔ اُس نے کوئی توجہ نہ دی اور میں ہورسٹ کو دیں چھوڑ کر روانہ ہو گیا اب ہورسٹ بالکل مطمئن تھا جبکہ میں تفکرات میں غرق نامعلوم منزل کی طرف رواں دواں تھا۔!

رکنقر بانمین

## ۱۴۔ خفیہ مشن

مئی ۱۹۴۴ء میں دوسری جنگ عظیم پورے زوروں پر تھی۔ بحری طاقت کا پھر پورا مظاہرہ ہو رہا تھا۔ بحرہند میں برطانوی ابدوزوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ اسی دوران فوجی ہائی کمان نے ایک نئی ابدوزا شارم (STORM) کو سیلون سے خفیہ مشن پر روانہ کیا۔ اس کے کیپٹن کمانڈرینگ تھے۔ انھوں نے بڑی شاندار خدمات انجام دی تھیں۔ اس مشن میں بھی اپنے نام کو روشن رکھا۔ واقعی اُن کا مشن بڑا سنسنی خیز تھا جسے سن کر ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس مشن کے حالات خود واقعی کی زبانی سنئے:

جب ہم خفیہ مشن پر روانہ ہوئے تو ہماری ابدوز پر ایک ربڑوں کی دھچپوٹی کشتی اور تین دوسرے آدمی موجود تھے۔ ان تینوں میں ایک بری فوج کا میجر، ایک بحریہ کا جہان اور ایک سماترا کا باشندہ تھا۔ ہماری منزل مقصود ہیو لو ویرہ نامی جزیرہ تھا جو سماترا کے شمال مغرب میں واقع تھا۔ وہاں پہنچ کر ہم سماترا کے باشندے کو دونوں ساتھیوں سمیت چھوڑنا چاہتے تھے تاکہ وہاں کی اطلاعات ہمارے ہیڈ کوارٹر پہنچ سکیں۔ اس زمانے میں شمال کے ایک بندرگاہ ”سابنگ“

پر جا پانیوں کا قبضہ تھا۔ ہماری آبدوز تھوڑی دور ہی گئی تھی کہ رٹوار نے اطلاع دی زمین تیس میل کے فاصلے پر ہے۔ آدھی رات کو ہم اس جگہ پہنچ گئے جس کی خبر ملی تھی۔ یہ جگہ پیو لو براس تھی جو پیو لو دیہہ سے صرف آٹھ میل دور تھی۔ یہاں سے ہم نے اپنی رفتار بہت کم کر دی تاکہ صبح تڑکے جزیرہ پہنچیں باب ہمارا سفر سمندر کے اندر ہی اندر تھا۔

جب ہم جزیرہ کے کافی قریب پہنچ گئے تو ہم نے پیرسکوپ سے ساحل کا جائزہ لیا۔ پہاڑیوں کا ایک طویل سلسلہ تھا جس سے سمندر کی لہریں جا جا کر ٹکرا رہی تھیں۔ آبدوز کھڑی کرنے کے لیے کوئی جگہ سمجھ میں نہ آئی تو اس کو ساحل کے ساتھ ساتھ جنوب مشرق میں لے گئے، جہاں سے ساحل کا فاصلہ کوئی ایک میل تھا۔ اس دوران اسٹیمر نظر آئے جو سامان لیے بار سے تھے۔ ان کی بند و قیں باسانی ہمیں نشانہ بنا سکتی تھیں لیکن ہم خاموش چلتے رہے اور انھوں نے بھی کوئی مداخلت نہ کی۔ ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ دوسرے دن شام کو ہم ایسی جگہ تھے جہاں اپنا کام بخوبی ہو سکتا تھا تاہم ہم نے انتظار کیا کہ چاند تھوڑا چڑھ جائے اور چاندنی پھٹک جائے کیونکہ بالکل اندھیرے میں زیادہ وقت پیش آئی۔ اب میں آبدوز کو اُپر لے آیا اور اگلے دروازے کو کھولا۔ میجر اور بحریہ کے نوجوان کو ڈونگی کے ذریعے ساحل پر پہنچنا تھا اور مجھ کو وہیں قرب و جوار میں ٹھہر رہنا تھا تاکہ آدھ گھنٹے تک انتظار کروں اور وہ بحیریت ساحل پر اتر جائیں تو میں واپس جاؤں اور تین گھنٹے بعد پھر انھیں جا کر لے آؤں چونکہ ڈونگی نظر آنے میں وقت ہو سکتی تھی

اس لیے میں نے میجر سے کہہ دیا کہ ٹم اپنی ٹارچ سے R کا حرف تین مرتبہ بنانا۔ پہلی اور تیسری مرتبہ تیزی کے ساتھ اور دوسری مرتبہ ذرا آہستہ آہستہ۔ تمام انتظام مکمل ہونے کے بعد میں نے ڈونگی کو اتارنے کا حکم دے دیا اور تینوں آدمی ڈونگی میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ میں بھی ایک محفوظ مقام پر رُک گیا۔ مگر ابھی ڈونگی کو روانہ ہونے صرف پونے تین گھنٹے ہی ہونے تھے کہ میجر نے R کا سگنل دیا۔ وقت ختم ہونے میں ابھی پندرہ منٹ باقی تھے اس لیے مجھے بڑی تشویش ہوئی تاہم میں فوراً ان کے پاس جا پہنچا اور ان کو واپس لے آیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ اپنا کام مکمل کر کے آئے ہیں اب مجھے اطمینان ہوا۔ ٹم کا پہلا حصہ مکمل ہو چکا تھا۔ سمارا کا باشندہ ابھی نہیں آیا تھا، اُس کی واپسی چار روز کے بعد ہوئی تھی چنانچہ تین دن بڑی بوریٹ میں گزرے۔

اس دوران میں نے کسی جہاز پر حملہ نہیں کیا کیونکہ حملہ کرنے سے ہم لوگ پکڑے بھی جاسکتے تھے چوتھے دن صبح ہی میں نے ساحل کے ساتھ ساتھ گشت شروع کر دی۔ سمارا والے کورات آنا تھا۔ وقت مقررہ سے آدھ گھنٹے پہلے ہی ہم سب تیار ہو کر کھڑے ہو گئے تاکہ ڈونگی کو لے کر ساحل کی طرف روانہ ہو جائیں۔ آبدوز سے ساحل کا فاصلہ کوئی ایک میل تھا۔ ہم لوگ اینجٹ کے سگنل کا انتظار کر رہے تھے۔ اس کو اپنی ٹارچ کی روشنی سے N کا حرف بنانا تھا اور ایک ایک منٹ کے وقفے سے بناتے رہنا تھا۔ بارہ بجنے میں پانچ منٹ باقی رہنے پر ہم لوگوں کی بے چینی قابل دید تھی گھڑی گھڑی ساحل کی

بہت سوچ بچار کے بعد میں نے بحث ختم کرتے ہوئے میجر سے کہا اب تم سوچ لو۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ اگر تم پانچ منٹ کے اندر ڈونگی لے کر نہ گئے تو میں آپریشن ختم کر کے واپس چلا جاؤں گا یہ ناممکن ہے کہ میں ایک رات پھر یہیں پڑا رہوں۔“

میجر نے کوئی جواب نہ دیا، فوراً بھاگا ہوا بحریہ کے نوجوان کے پاس جا پہنچا اور ڈونگی لے جانے کی تیاری شروع کر دی۔ وہ بے انتہا ڈرا ہوا تھا۔ لیکن اس کے سوا کوئی دوسرا راستا بھی نہ تھا۔ مجھے اس پر ترس بھی آ رہا تھا کہ وہ موت کے منہ میں جا رہا ہے لیکن میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ قومی خدمت اُس سے زیادہ اہم تھی۔ البتہ میں نے یہ کہا کہ آدھی دوڑ تک میں بھی چلوں گا چنانچہ میں نے آبدوز کو ساحل سے آٹھ سو گز کے فاصلے پر کھڑا کیا۔ ڈونگی سمندر میں اتر گئی اور ساحل کی طرف بڑھنے لگی اور میں آبدوز میں واپس آ گیا۔ دریں اثنا ساحل سے ٹاپر کی روشنی آتی بند ہو گئی۔ میں نے دور بین سے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ساحل کے نزدیک سمندر میں ایک سیاہ دھبہ حرکت کرتا نظر آیا۔ میں سمجھا کہ کشتی واپس آ رہی ہے لیکن یہ اطمینان بھی وقتی ثابت ہوا کیونکہ جلد ہی پھر ٹاپر کی روشنی سے اجنبان دکھائی دینے لگا۔ اب کے وہ جلدی جلدی آہن رہا تھا اور آہستہ آہستہ بائیں جانب بڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یقیناً کچھ گڑ بڑ ہے۔!

اچانک ایک زوردار دھماکا ہوا اور ساحل پر شعلے بلند ہوتے ہوئے نظر آنے لگے۔ میں نے بغور دیکھا تو معلوم ہوا کہ میری آبدوز پر ساحل کی پھلی بیٹری

طرف دیکھتے اور ایجنٹ کے سگنل کو تلاش کرتے جب ٹھیک بارہ بج گئے اور کوئی سگنل نہ آیا تو بے انتہا گھبراہٹ ہوئی۔ کبھی اپنی گھڑی کا ٹکڑا بے جلتے اور دیکھتے کہ چل بھی رہی ہے یا بند ہو گئی جب کوئی وجہ سمجھ میں نہ آئی تو مختلف دوسرے پیدا ہونے لگے۔ اس کے باوجود میں نے میجر سے کہا کہ اگر آج آدھ گھنٹے تک سگنل نہیں آتا تو کل تک انتظار کریں گے اور اس کے بعد کوئی قدم اٹھائیں گے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اُسے جاپانیوں نے پکڑ لیا ہو اور اس سے پوچھ گچھ کر رہے ہوں مگر جو نہی آدھ گھنٹہ گزرا، سگنل نظر آنے لگا۔ اب ہم لوگ ایک شش دہج میں مبتلا ہو گئے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ جاپانیوں نے اس سے پوچھ کر خود ہی سگنل دینا شروع کر دیا ہو۔ یا سماترا کا باشندہ وہاں پہنچ کر باغی ہو گیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ خیال بھی آیا کہ ممکن ہے اس کی گھڑی بند ہو گئی ہو اور وہ بے چارہ وقت کا اندازہ نہ کر سکا ہو۔ ایک مشکل یہ بھی آئی کہ پڑی تھی کہ سگنل ٹھیک اس جگہ سے نہیں آ رہا تھا جہاں آدمی کو چھوڑا تھا بلکہ اس سے کافی فاصلے سے آ رہا تھا۔ ان حالات میں ہم نے یہی طے کیا کہ آج اس کو واپس لینے کے لیے نہ جائیں کل لائیں گے کیونکہ اس سے طے کر لیا تھا کہ ایک دن نہ اٹھایا تو دوسرے دن اٹھائیں گے۔

دوسری شب سگنل آدھ گھنٹہ لیٹ آیا۔ اب تو ہم بہت مشکل میں پڑ گئے ہمیں یقین ہو گیا کہ سگنل جان بوجھ کر اس وقت دیا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ فکر مجھے لاحق تھی کیونکہ میں آبدوز کا کیپٹن تھا اور آخری ذمہ داری مجھ پر ہی تھی۔ مجھ میں اور میجر میں بحث ہوتی رہی کہ اُس کے پاس جاؤں یا نہ جاؤں۔

پر سے چار جگہ سے ٹائزنگ شروع ہو گئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ آبدوز کے پچھلے حصہ پر بھی گولہ باری ہو رہی ہے۔ یہ دیکھ کر میں نے بھی حکم دے دیا کہ فائر کیے جائیں۔ ہمارے بندرچی نے بھی گولے برسائے شروع کر دیے لیکن ہمارے پاس صرف ایک ہی آدمی تھا جبکہ ہم پر پانچ طرف سے یورش ہو رہی تھی۔ آبدوز کے ڈھانچے پر گولے آ کر گر رہے تھے۔ اور کسی لمحہ بھی آبدوز کے ڈوبنے کا خطرہ تھا۔ ہمارا بندوچی صحیح جگہ گولی چلانے میں ناکام ہو رہا تھا۔ میرے اوسان خطا ہونے لگے اور میں سوچنے لگا کہ جو کچھ نہیں کر رہا ہوں کیا حکومت اس کی توثیق کر دے گی؟ کیا ایک آدمی کی جان بچانے کے لیے پچاس آدمیوں اور ایک قیمتی آبدوز کو ہلاکت میں ڈالا جاسکتا ہے؟ یقیناً ان سوالوں کے جوابات نفی میں تھے تاہم دل نہ مانتا تھا۔ بار بار یہی خیال آتا تھا کہ کیوں نہ تھوڑی دیر اور دیکھ لیا جائے؟

آخر میری ہچکچاہٹ کام آگئی۔ وہ سیاہ دھبہ اپنی ڈونگی کا تھا جواب کافی قریب آچکی تھی۔ جب وہ قریب سو گزرہ گئی تو میں نے میجر اور جوان دونوں کو پہچان لیا۔ رلبہ سائرا کا باشندہ غائب تھا میجر تو کشتی میں تھا لیکن جوان ایک ہاتھ سی کشتی کو پکڑے ہوئے علیحدہ سمندر میں تیر رہا تھا۔ بالآخر ایک ناممکن بات ممکن ہو گئی۔ وہ دونوں چند گز کے فاصلے تک آ گئے۔ میجر سوچنے لگا کہ کہاں سے آبدوز پر جاؤں میں نے چلا کر کہا: کشتی کی پرواست کرو۔ تم دونوں آجاؤ بس! درزوں نے ایسا ہی کیا۔ ان کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ بازو شل ہو چکے تھے لیکن بدقت تمام آبدوز پر پہنچ گئے ان کے اندر آنے کے بعد جب میں نے

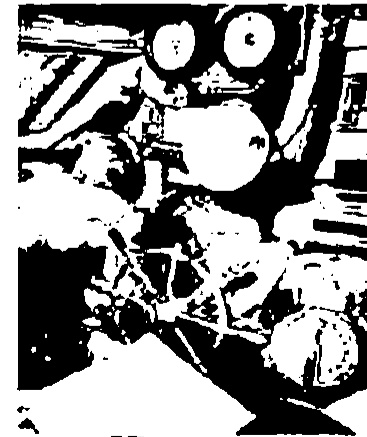
دروازہ بند کیا تو گولوں کی آواز میں بڑھ چکی تھیں۔ میں نے فوراً آبدوز کو سمندر کی تہ میں لے جانے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ آبدوز اتنی گہرائی میں چلی گئی کہ سطح زمین صرف بیس فٹ رہ گئی۔

اب یہ فکر پیدا ہوئی کہ کیسے اندر ہی اندر آبدوز شکن آبدوزوں کا بیڑہ حملہ نہ کر دے لہذا ہم نے اپنی رفتار بہت آہستہ کر دی اور دوسری آوازوں کو سننے لگے لیکن یہیں ذرا بھی آہٹ محسوس نہ ہوئی۔ کوئی وسیلہ تک پانی کے اندر چلنے کے بعد ہم اُپر آئے۔ اب گولیاں چلنی بند ہو چکی تھیں۔ میں نے دورین سے دیکھا تو ساحل نظر نہ آ رہا تھا۔ اب اطمینان ہو گیا۔ میں نے انجن کو پوری رفتار سے چلا دیا اور میلوں تک کا فاصلہ طے کر لیا تاکہ خطرے کا شائبہ بھی نہ رہے۔ کوئی پالیس میل نکل جانے کے بعد ہم نے سوچا کہ اب آرام کر لیا جائے کیونکہ اب کافی تھکن ہو چکی تھی۔ یہ سوچ کر اسی حصے میں گشت شروع کر دی۔ تعجب تو اس بات پر تھا کہ اس پوری ٹیم کے دوران دشمن کا نہ تو کوئی جہاز بلا اور نہ کوئی آبدوز۔

اب میجر اور بحریہ کے نوجوان دونوں کی تھکن اُتر چکی تھی اور وہ کچھ سکون محسوس کر رہے تھے چنانچہ میں نے ان سے پوچھا کہ بتاؤ تو سہی تم پر کیا گزری۔ انہوں نے جواب دیا: جب ہم لوگ ساحل کے قریب پہنچے تو ایسا لگا کہ روشنی آہستہ آہستہ بائیں طرف حرکت کر رہی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک چھوٹی سی غلیج کے پاس آکر ٹھہر گئی۔ اس غلیج پر مکمل اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ساحل درختوں اور جھاڑیوں سے گھرا ہوا تھا۔ ہم نے کشتی روکی اور ساحل پر اترے۔ معاً ہمارے کانوں میں سائرا والے آدمی کی آواز آئی۔ وہ نہایت غصے کے عالم میں چیخ رہا تھا: مجھے چلو مجھے

ے چلو! میں بہت زخمی ہو گیا ہوں۔“ میجر اور جوان آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ یہ آواز کدھر سے آ رہی ہے اور اُسے کیونکر بچا کر لایا جائے؟ اچانک قریب ہی سے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ نے انہیں ہونکا دیا اور ایک غیر معمولی نقل و حرکت محسوس ہوئی۔ میجر نے کہا: مجھے تو کوئی زبردست خطرہ معلوم ہوتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ یہاں سے نکل چلو۔ چنانچہ دونوں کور کر اپنی کشتی پر آگئے اور انھوں نے تیز تیز کشتی بھگانے شروع کر دی۔ اسی اثناء میں مشین گنوں سے گولیوں کی بوجھاڑ شروع ہو گئی میں نے جوان سے کہا کہ تم کشتی سے کور ہاؤ اور الگ تیر و تاکہ اگر کشتی تباہ ہو تو تم بچ جاؤ اور واپس جا کر اطلاع دے سکو۔ اس کے برخلاف تم ختم ہو جاؤ گریں کسی صورت سے پہنچ جاؤ۔“

یہ داستان سن کر میں بہت افسوس ہوا۔ بالخصوص سکاٹرا والے آدمی کے بارے میں کچھ نہ پتا چلا کہ آخر اس پر کیا گزری۔ ایسا محسوس ہوا کہ اس کی پشت پر پستول کھرا اس سے راز کھلانے کی کوشش کی گئی تھی۔ ۱۹ مئی کو میں نے ٹرمکولی کو اطلاع کر دی کہ ہمارا مشن ناکام ہو چکا ہے۔ کچھ دن بیولو و بیہ میں گشت کرتے رہے۔ ۲۴ مئی کو واپسی کا حکم ملتے سیلون واپس چلے گئے۔ اس طرح (STORM) کا خفیہ مشن ملوانوں کی نذر ہو گیا۔!



Commander Young

Submarine  
HMS-P555  
Storm

## ۱۵۔ ایک راستہ چین کا۔!

لیفٹیننٹ کمانڈر گڈون دوسری جنگ عظیم میں جاپانیوں کے ہاتھوں قید ہو گیا تھا۔ وہ نیوزی لینڈ کا رہنے والا تھا۔ جاپانیوں نے اسے ہانگ کانگ کے فوجی کیمپ میں بند کر دیا اور تین سال تک اُن کے مظالم کو جھیلنا رہا۔ قید کے دوران وہ مسلسل یہی سوچتا رہا کہ کسی صورت یہاں سے فرار ہو لیا جائے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ بحالت موجودہ اس کو کسی دن جان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے لیکن اگر وہ بھاگ گیا تو ہو سکتا ہے کہ اس کی جان پرچ جائے۔ فوجی کیمپ سے نکلنا تو اتنا مشکل نہ تھا کیونکہ یہاں رہتے ہوئے اُس کو تین سال ہو گئے تھے اور وہ محافظوں کی کمزوریوں سے خوب واقف ہو گیا تھا۔ چور دروازے بھی اُس نے تار رکھے تھے۔ البتہ کیمپ سے باہر اُس کو زیادہ خطرہ تھا کیونکہ اول تو اس کو چینی زبان نہیں آتی تھی۔ دوسرے یہ کہ راستے گلی سے کوئی واقفیت نہ تھی۔ جگہ جگہ فوجوں کی نقل و حرکت تھی۔ جاسوسوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ان وجوہ کی بنا پر اُس کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ آخر ایک دن اُس کی مہم جو طبیعت اور حوصلے نے تمام دوسوسوں کو پس پشت ڈال کر نکل بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

فوجی کیمپ سے نکل کر وہ ایک سڑک پر ہو گیا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد سڑک ختم ہو گئی اور ایک ریلوے لائن مل گئی جس پر پٹہ بنا ہوا تھا۔ اس پر کھڑے ہو کر اُس نے دیکھا تو کوئی چار سو گز کے فاصلے پر ایک جزیرہ تھا جس کے بارے میں وہ پہلے بھی سُن چکا تھا کہ اس جزیرہ تک ایک پتھروں کا راستہ جاتا ہے۔ جزیرہ پر کچھ پہاڑیاں بھی تھیں جن کی وجہ سے جزیرہ صاف نظر نہ آ رہا تھا۔ اس جزیرہ پر چینی کشتیاں آکر لنگر انداز ہوتی تھیں۔ اُس نے سوچا کہ اسی راستے سے چلا جائے اور ایک سپین دھنی کشتی چڑا کر سمندری راستے سے آگے نکل جائے کیونکہ خشکی کے مقابلے میں یہ زیادہ محفوظ راستا تھا اور سفر بھی ہزاروں میل کم ہو سکتا تھا۔ سڑک پر پہلنا خطرناک بھی تھا۔ اکاؤنٹا راہگیر وہاں سے گزرتے رہتے تھے۔ آخر اُس نے آؤ دیکھا نہ ناؤ، جھٹ کپڑے اتارے، ایک بیڈ جو اس کے پاس موجود تھا، دانٹوں سے رہایا اور سمندر میں گر دیا۔ تیرنا اس کو آتا ہی تھا، آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا اور کنارے کنارے دیکھتا چلا گیا۔ اتفاق سے اُس دن وہاں کوئی سپین نہ تھی۔ اب تو وہ بڑا پریشان ہوا مگر کچھ کچھ تو اس کو بہر حال کرنا ہی تھا۔ اب اُس نے سوچا کہ کسی چھوٹی کشتی کے ملاح سے خوشامد کی جائے شاید وہ اُسے کچھ دور پہنچا دے۔ اس ترکیب میں خطرہ تو بہت تھا لیکن کوئی دوسرا چارہ کار بھی نہ تھا۔ چنانچہ وہ سب سے دور والی کشتی کے ملاح کے پاس پہنچا تا کہ ساحل والوں کو خبر نہ ہو اور اس سے آسان انگریزی میں بڑی لمباحت سے کہا کہ اُسے خلیج پار کرادے۔ ملاح پہلے تو ٹیچکا سنتا رہا لیکن ابھی وہ اپنا جملہ

ختم بھی نہ کر پایا تھا کہ ملاح ایک دم کھڑا ہو گیا اور زور زور سے چلنے لگا۔ اس کی شکل سے لگ رہا تھا کہ وہ سخت غصے کے عالم میں ہے۔ اس نے بڑی منت سماجت کی کہ خدا کے واسطے تم خاموش رہو۔ چاہے لے جاؤ یا نہ لے جاؤ۔ لیکن اُس نے ایک نہ سنی اور اُس کو کتے دکھاتا رہا۔

اب گڈون نے سوچا کہ کہیں اس چیخ و پکار کو ساحل والے نہ سُن لیں اور کوئی مصیبت نہ کھڑی نہ ہو جائے، بہتر یہ ہے کہ وہ چپکے سے کھسک جائے یہ سوچ کر وہ واپس ہو گیا مگر جیسے ہی دوسری کشتی کے قریب سے گزرا، اس پر بیٹھے ہوئے چار پانچ آدمیوں نے اُس پر لکڑیوں سے حملہ کر دیا۔ انھوں نے غالباً پہلے ملاح کی چیخ و پکار سُن لی تھی اور اُسی کی حماست میں حملہ آور ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے بھی بڑا شور و غوغا کیا۔ صورت حال بڑی مخدوش ہو چکی تھی۔ گڈون تیزی سے بھاگتا ہوا اُس جگہ آگیا جہاں سے چلا تھا۔ اتنے میں ساحل کے نزدیک اُسے پانی کے اندر کچھ سرسراہٹ محسوس ہوئی اور اُس کے کان کھڑے ہو گئے مگر ابھی وہ کوئی رائے قائم نہ کرنے پایا تھا کہ کسی سے اُس کی زوردار شکریہ ہو گئی، جو کوئی دوسرا آدمی تھا۔ شکر لگتے ہی وہ خوف زدہ ہو کر ایک طرف کو بھاگنے لگا۔ غالباً کوئی اسمگلر تھا جو ساحل پر پڑے ہوئے سپاہیوں سے بچتا بچتا ادھر آ نکلا تھا۔ اب جو اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو کشتیوں کے قریب کے ساحل پر ایک بلبل سی دکھائی دی۔ ہر طرف لائینس نظر آرہی تھیں۔ وہ یقیناً اس مفرور کو تلاش کر رہے ہوں گے۔

آخر گڈون نے فیصلہ کر لیا کہ وہ پیدل ہی جائے گا۔ کسی سے مدد مانگنا

لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ اُس کے قریب ہی ایک سنتری کھڑا ہے۔ خوش قسمتی سے کوئی اُسے نہ دیکھ سکا اور وہ چپکے سے نکل گیا۔ اب اس نے دوسری شرک پٹرلی اور سوچا کہ ادھر قسمت آزمائی کی جائے۔ وہاں ایک نہت بڑا گیٹ بنا ہوا تھا جو نہی وہ اس گیٹ میں داخل ہوا تو اُسے برابر پٹرول کی بو آئی اور لوگوں اور جانوروں کے خراٹوں کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ یہاں سے بھی وہ اُلٹے قدم واپس ہوا۔ اسی طرح ایک طرف سے دوسری طرف چلتے چلتے رات ختم ہو گئی اور پو پھٹنے لگی۔

دن بھی رات سے کچھ کم نہ تھا، کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے، موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ تیز طوفانی ہوائیں سفر کو دشوار کیے دے رہی تھیں۔ گڈون ایک چٹان کی آڑ میں بیٹھ گیا۔ دُور دُور تک کوئی جھنگا بھی نظر نہ آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد وہ پھر نکل کھڑا ہوا۔ اب کے وہ پہاڑیوں کو عبور کر رہا تھا۔ اُس نے یکے بعد دیگرے تین پہاڑیاں طے کیں۔ شام ہوتے ہوتے وہ ایسی جگہ جا پہنچا جہاں اناس کے درختوں کے جھنڈ تھے لیکن اناس سب کچے تھے۔ ایک درخت میں ایک پھل کچھ پکا معلوم ہوا، اُسے اُس نے توڑ کر کھایا۔ خدا جانے وہ میٹھا تھا یا ترش۔ اُسے بھوک میں بڑا خوش ذائقہ لگا اور وہ جلدی جلدی سب کھا گیا۔ کھانے کے بعد اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کافی دُور کھیتوں کے کنارے اُسے ایک بگڑندہ نظر آئی۔ پل بھی اسی مقام پر ختم ہوتا تھا۔ وہ پہاڑی کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا گیا۔ یہاں گھٹنوں گھٹنوں پانی اور کچر تھا۔ تھوڑا فاصلہ یوں طے کرنے

زبردست مصیبت مول لینا ہے۔ وہ کافی تھک چکا تھا، اُس کا سارا بدن ٹوٹ رہا تھا تاہم ٹھہرنا کسی صورت بھی مناسب نہ تھا اس لیے اس نے قدم بڑھا دیے۔ سانسے ایک ریلوے پل تھا اُس نے اس پل پر چلنا شروع کر دیا۔ یہ پل بھی عجیب تھا۔ ریل کی پٹریوں کے نیچے کے سیلینز سچ بیچ سے غائب تھے اور خالی جگہ سے سمندر نظر آتا تھا۔ دو سیلپروں کے درمیان ایک قدم کا فاصلہ تھا لیکن کہیں ایک اور کہیں دو سیلپر غائب تھے اس لیے نیچے گرنے کا اندیشہ تھا۔ چنانچہ اُس نے گھوڑے کی طرح ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلنا شروع کیا۔ نیچے دیکھنے پر ایسا لگا کہ سمندر کے ساتھ ساتھ ایک خشک پٹی ہے اور اس کے برابر ایک نہر ہے۔ نہر کے کنارے کنارے درخت لگے ہوئے ہیں۔ مگر بغور دیکھنے پر معلوم ہوا کہ نہر نہیں ہے بلکہ نچتہ شرک ہے۔ گڈون پل پر سے ڈرتے ڈرتے واپس ہوا اور نیچے شرک پر ہویا، لیکن مصیبتیں ختم ہونے میں نہ آتی تھیں۔ شرک پر تھوڑی ہی دُور جانے کے بعد دیکھا کہ وہ سمندر تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے۔ اب اس کا دماغ چکر اگیا۔ وہ پھر ٹوٹا اور شرک کے دوسری طرف چل دیا۔ کچھ دُور جانے کے بعد کئی شرک مل گئی اس شرک پر چلتے چلتے ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں مکانات ملنا شروع ہو گئے۔ اب وہ بڑی احتیاط سے چل رہا تھا۔ ایک مقام پر شرک تھوڑی اُونچی ہو کر پھر ہوار ہو گئی تھی۔ جب یہ چڑھائی سے اُپر گیا تو پسینے چھوٹنے سے زیادہ سے زیادہ آٹھ فٹ کے فاصلے پر ایک آدمی دکھائی دیا۔ جواہر آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہا تھا۔ پہلے تو وہ یہ سمجھا کہ شاید اسی سے کچھ کہہ رہا ہے



اسیشن گتا بھی تھا جو نہی اُس نے سپاہیوں کو دیکھا وہ اچھل کر ایک قریبی  
جھاڑی میں چھپ گیا۔ دو ایک قدم اور چلتا تو یقیناً تصادم ہو جاتا۔ اب  
اُس کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔ فرط خوف میں اُس نے حرکت تو  
درکنار سانس بھی روک لی۔ اور گتے نے تو کمال ہی کر دیا۔ وہ اپنا منہ اُس کے  
منہ کے پاس لے گیا، کانوں کو بلایا، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگا پھر  
اُس نے سر کو جھکایا اور بغیر کسی غراہٹ کے آگے بڑھ گیا۔ چند لمحوں کے وقفے سے  
سپاہیوں کی آواز قدرے تیز ہوئی تو وہ سمجھا کہ شاید آ رہے ہیں لیکن بعد میں  
آواز خائب ہو گئی۔ البتہ یہ بات اُس کی سمجھ میں نہیں آئی کہ کیا کیوں نہیں  
بھونکا؟ کچھ کہتے ہیں کہ وہ گڈون کی گندگی دیکھ کر خود بھی پکڑ میں آ گیا تھا، بعض  
کا خیال ہے کہ اُس کی حفاظت کر رہا تھا۔ ایک بات یقینی کہی جاسکتی ہے کہ  
جن حالات میں گتے نے اُس کو دیکھا تھا ان حالات میں ہر گنا ایسا ہی کچھ  
کرتا جیسا کہ اسیشن نے کیا تھا۔

اب اُسے یقین ہو گیا کہ آگے سڑک صاف ملے گی چنانچہ اُس نے  
قدمے تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ آگے جا کر ایک سڑک ۵۴ دسے پر پڑی  
ہوئی ملی۔ جسے اُس نے نقشے میں دیکھ کر پہچان لیا۔ وہ دبے پاؤں اُس  
سڑک پر بڑھنے لگا۔ کہیں کہیں اکاڑ کا عمارتیں بھی مل جاتی تھیں لیکن ان  
میں روشنی نظر نہ آتی تھی۔ غالباً وہ خالی پڑی تھیں۔ بارش ختم ہو چکی تھی۔ کنارے  
کنارے پہاڑیوں کے سلسلے تھے جن پر سایہ دار درخت تھے چونکہ اُسے چلتے  
پہلے دو دن اور دورائیں گزر چکی تھیں اس لیے وہ ایک جگہ آرام کرنے کے

کے بعد ایک راستہ پتھروں کا مل گیا جس پر چلنا کچھ آسان نہ تھا۔ وہ اس پر  
سے ہو کر کھیتوں کے کنارے پہنچ گیا جہاں سے پگڈنڈی شروع ہوتی تھی۔  
اس پگڈنڈی پر وہ خوشی خوشی چل دیا۔ بادل چھٹ چکے تھے اور آسمان  
پر تارے نکل آئے تھے۔ پگڈنڈی ختم ہونے کے بعد سڑک مل گئی اور وہ سکون  
کے ساتھ سڑک پر ہویا۔ میل پر میل گزرتے رہے اور وہ دو دن کا تھکا ہارا آگے  
بڑھتا رہا۔ ایک مقام پر اُسے سڑک کے کنارے بہت سے آدمی نظر آئے  
جو آپس میں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ ٹھیک اسی وقت پیچھے سے ایک  
کار آئی جس کی بلیوں کی روشنی اس پر پڑی۔ وہ ایک درخت کے ساتھ  
کھڑا ہو گیا۔ کار نکل گئی۔ اُس نے دیکھا کہ اس میں کئی جا پانی افسر بیٹھے ہوئے  
تھے۔ وہ پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ چلتے چلتے ایک مقام پر اُسے عمارتیں  
نظر آنے لگیں۔ کچھ سپاہی بھی نظر آئے جو لائینیں لیے ہوئے ادھر ادھر گھوم  
رہے تھے۔ وہ ایک بار پھر گھبرا گیا۔ کچھ دور پر ریلوے لائن سڑک کو پار کر رہی  
تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کرائسنگ پر ضرور پہرہ ہوگا۔ لہذا اُس نے اپنا راستہ  
بدل کر تھوڑے فاصلے سے پٹریوں کو کراس کیا اور دوبارہ گھوم کر سڑک پر  
آگیا۔

رات بہت اندھیری تھی۔ بوند باندی ہو رہی تھی۔ اس کا سفر جاری تھا  
کہ اچانک اُسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ سر اٹھا کر دیکھا تو تین فٹ کے  
فاصلے پر چھ سپاہی چلے آ رہے تھے۔ ان کے پیروں میں ربر کے تیلے والے  
جوتے تھے اس لیے ذرا بھی آہٹ نہ ہوئی۔ آخری سپاہی کے ساتھ ایک



بیٹھ گیا۔

جیل سے فرار ہوئے اُسے ساتواں دن تھا۔ اس عرصے میں ایک دن میں اس نے زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹہ آرام کیا تھا۔ کھانے میں اُس کے پاس ایک دودھ کا ڈبہ تھا۔ اس کے علاوہ ایک ڈبہ سویا بین پاؤڈر دیا، ایک چھوٹی بوتل میں مونگ پھلی کا تیل، تھوڑا سا پانی اور ایک ڈبے میں پسی ہوئی کالی مرچیں بھی۔ کالی مرچ کو اس لیے لیا تھا کہ راستے میں ڈالتے جائیں گے تاکہ کتے بھیچا نہ کریں لیکن مسلسل بارش سے اس کا استعمال بے معنی ہو گیا۔ اب اُس نے اس کو کھلنے میں ڈال ڈال کر کھایا۔ بہر حال کھانے کی کس کو پروا تھی۔ زندہ رہنے کے لیے کچھ نہ کچھ پیٹ میں ڈال لینا ضروری تھا۔ مسلسل چلتے رہتے اور نہ سونے کی وجہ سے دونوں نظام بگڑ چکے تھے۔

دوپہر کو سورج نکلنے کے آثار پیدا ہوئے تو اُس نے اپنے کپڑے اتار کر درختوں پر سوکھنے کو ڈال دیے۔ کاغذ وغیرہ بھی پھیلا دیے۔ جب تمام چیزیں کچھ خشک ہو چکیں تو ان کو اکٹھا کیا، سمیٹ کر سرمانے رکھا اور تھوڑی دیر کے لیے سو گیا۔ آنکھ کھلی تو اندھیرا ہو رہا تھا۔ دس منٹ انتظار کرنے کے بعد وہ پھر چل پڑا۔

سڑک پہاڑیوں میں سے ہوتی ہوئی جا رہی تھی۔ بادل پھر آہستہ آہستہ پھیلتے جا رہے تھے اس لیے مکمل اندھیرا چھا چکا تھا۔ گڈون کا سفر جاری تھا۔ اچانک اس کو تھوڑے فاصلے پر کچھ روشنی نظر آئی۔ شروع میں وہ کچھ مدھم مدھم

لیکن تیزی کے ساتھ بڑھ رہی تھی۔ وہ پک کر ایک گڑھے میں بیٹھ گیا چند لمحوں میں تمام ماحول روشن ہو گیا اور ایک کار سڑک پر گزر گئی۔ اس کے جلنے کے بعد وہ پھر روانہ ہو گیا۔ کچھ دُور پر پھر چند عمارتیں نظر آئیں۔ گڈون بچتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ اتنے میں اُس کو ایک سرسراہٹ محسوس ہوئی اور فوراً ہی ایک رافٹل اُس کی آنکھوں کے سامنے سڑک پر آگرمی۔ گڈون کے ہوش اُڑ گئے۔ اُس نے چاروں طرف دیکھا مگر کوئی نظر نہ آیا۔ آخر وہ خود بخود پیچھے کھسک گیا اور اُس نے دُور راستہ اختیار کر لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے سڑک دیکھا تو ایک سنتری زیر لب بڑبڑا رہا تھا اور جھک کر رافٹل اٹھا رہا تھا۔ اب گڈون اپنے نئے راستے پر آگے بڑھنے لگا۔ چلتے چلتے اُس کو ایک گاؤں بلا جو پہاڑی کے دامن میں واقع تھا۔ راستہ اس گاؤں کے نیچے سے ہو کر جاتا تھا۔ گڈون اس پر چلتا رہا۔ گاؤں کے ختم ہونے پر راستہ داہنی طرف مڑ گیا اور اس کو دُور تک کھیت ہی کھیت نظر آنے لگے کھیتوں کے اُس پار لالٹینوں اور طارچ کی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ اصل میں "ٹشاکا" نامی گاؤں تھا جو ایک بڑی منڈی تھا اور پھیروں کی بستی بھی۔

یہ گاؤں چین اور جاپانی مقبوضہ علاقوں کی سرحد پر واقع تھا۔ گاؤں کا نام تو اس کو پہلے ہی سے معلوم تھا، نقشے سے اُس نے تصدیق بھی کر لی۔ خیال تھا کہ اس گاؤں کو جانے والی ہر سڑک پر پہرا ہوگا، اس لیے گڈون نے دُور راستہ اختیار کیا۔ یعنی اُس نے پہاڑیوں میں سے

ملاح موجود تھے اور ایک وسیع و عریض سمندر اس کو آنا دی کا  
مژدہ سنارہا تھا!



R. H. Goodwin



## Hongkong Escape

**Lt. Commander Ralph Goodwin**

ہو کر چین کی سرحد میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا اور گاؤں کے شمال کی  
طرف بڑھنے لگا۔ پہاڑیوں پر کمر کرتک اُونچی کانٹے دار جھاڑیاں تھیں۔  
اس کی ڈانگوں پر سینکڑوں خراشیں پڑ گئیں لیکن اس خوشی کے سامنے تمام تکلیفوں  
کا خاتمہ ہو چکا تھا کہ چین کی سرحد دراصل اس کی آزادی کی سرحد ہو گئی جس کے  
قریب پہنچتے ہی اُسے کانٹے دار تاروں کے گھیرے ملنے لگے۔ ان کو پار کرنے  
کے بعد تپا چلا کہ اس گاؤں میں پہنچنے کے بے کھیتوں سے گزرنا بہت  
ضروری ہے۔ گاؤں کے چاروں طرف سخت پہاڑ تھا۔ سفتری مسلسل ٹارچ  
کی روشنی کھیتوں پر ڈال رہے تھے اور سپاس سپاس گز کے فاصلے پر کھڑے  
تھے۔ گڈون نے ایک لمحے کے اندر فیصلہ کر لیا کہ داہنی طرف کے کھیتوں  
میں گھسنا زیادہ محفوظ ہے چنانچہ اُس نے ایسا ہی کیا۔ آگے چل کر دیکھا تو  
کھیتوں میں بے انتہا پانی بھرا ہوا تھا۔ اب وہ بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ کون سا  
راتنا اختیار کرے؟ وہ اس قدر تھک چکا تھا کہ اس سے کھڑا بھی نہیں ہوا  
جا رہا تھا اور حوصلہ جواب دیتا جا رہا تھا۔ پھر بھی وہ کھیت کے اندر ہی اندر  
آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ اُمید کے خلاف اُس کو جلد ہی ایک بندل گیا، جو  
آٹھ فیٹ بلند تھا۔ اس پر بہت سی جھاڑیاں اور کانٹے دار درخت لگے  
تھے اور کانٹے دار تاروں کے جھگے بھی تھے۔ وہ ان سب میں سے گزرنا ہوا  
بند کے اوپر چڑھ گیا اور کھڑے ہو کر چاروں طرف نظر دوڑانے لگا۔ کوئی سو  
گز کے فاصلے پر سمندر کی لہریں ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔  
گڈون پکٹا ہوا ساحل کے قریب پہنچ گیا، جہاں مسکراتے ہوئے

## غذا اور صحت

تندرست رہنے کے لیے اچھی غذا کی ضرورت ہے اور اچھی غذا وہ ہے جو متوازن ہو یعنی اس میں وہ تمام وٹامنز اور معدنی اجزاء مناسب مقدار میں موجود ہوں جن سے جسم کی نشوونما ہوتی ہے۔ اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں غذا اور وٹامنز پر نہایت تفصیل سے بحث کی گئی ہے اور وٹامنز کی کمی سے پیدا شدہ امراض کے علاج مختلف غذاؤں سے تجویز کیے گئے ہیں۔ قیمت:

## ورزش اور صحت

تندرستی کے لیے صحت بخش غذا کے علاوہ ورزش بھی ضروری ہے اور ورزش کے لیے آپ کو کسی اکھاڑے میں جانے کی ضرورت نہیں۔ آپ گھر پر ہی روزانہ صرف دس منٹ یہ ہلکی ٹھپکی اور آسان ورزشیں کر کے اپنے جسم کو چاق و چوبند، سٹول اور متناسب بنا سکتے ہیں۔ مردوں اور عورتوں کے لیے الگ الگ ورزشیں دی گئی ہیں اور ہر ورزش کو تصویروں کے ذریعے سمایا گیا ہے۔

## میک اپ اور حسن

میک اپ تو سبھی عورتیں کرتی ہیں لیکن طریقہ کسی کسی کو آتا ہے۔ میک اپ ایک آرٹ ہے۔ اس کی بدولت ایک عام اور پاٹ سے چہرے کو دلکش اور سحر انگیز بنایا جاسکتا ہے۔ یہ کتاب میک اپ کی ایک ماہر خاتون کے تجربات کا مجموعہ ہے اس میں انھوں نے آرائش حسن کے تقریباً تمام پہلوؤں کو طریقوں کے علاوہ قدرتی حسن و رعنائی کو قائم رکھنے کے گُر بھی بتائے ہیں۔ قیمت:

لاہور

# خلت قزاق

تصنیف: ہیرلڈ لیم  
ترجمہ: محمد ہادی حسین

سترھویں صدی کے ایک تاتاری سورا، خلّت قزاق کی  
مہم جوئی اور جنگی کارناموں کی دل چسپ، حیرت ناک اور لرزہ خیز داستان۔  
مشہور امریکی داستان گو ہیرلڈ لیم نے تاریخ کے اس  
فراموش شدہ ہیر و کر اپنے جادو نگار قلم سے قیامت تک کے لیے  
لافانی بنا دیا ہے۔

میدان جنگ کے رونگٹے کھڑے کر دینے والے مناظر

عجیب و غریب محلاتی سازشیں

حسن و عشق کی سحر کاریاں اور دل آویزیاں

اس کتاب کے چار حصے ہیں لیکن

ہر حصہ اپنی جگہ ایک مکمل کتاب ہے

۱۔ خلّت قزاق

۲۔ خلّت قزاق پر اسرار دنیا میں

۳۔ مخوف ستارہ اور خلّت قزاق

۴۔ خلّت قزاق کے آخری معرکے

یہ کتابیں فیروز سنز لمیٹڈ نے نوے سے سو مطبوعات فرنیکلن

کے اشتراک سے شائع کی ہیں۔



کراچی



راولپنڈی



لاہور

فیروز سنز لمیٹڈ